محرم الحرام ۱۴۴۶ھ JULY 2024

ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور



دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

مدرسہ مظاہر علوم کا ترجمان

ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور

جلد نمبر ۳۰
شمارہ نمبر ۳

بابت
محرم ۱۴۴۶ھ
جولائی ۲۰۲۴ء

زرِ تعاون
فی شمارہ ——— ۳۰ روپے
سالانہ زرتعاون ——— ۳۰۰ روپے
بیرون ملک سالانہ ——— ۲۵ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)
MAZAHIR ULOOM MONTHLY MAGAZINE
SAHARANPUR 247001(U.P.) INDIA
Ph: 0132-2655542
Email-jamiamazahir@gmail.com

اس شمارے میں

○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے، آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/ تاریخ کو حوالہ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ ۱۰/ تاریخ تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نوائے سحر

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں

عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

خانہ کعبہ کی زیارت وطواف اور صفاومروہ کی سعی، منیٰ وعرفات میں حاضری کی سعادت حاصل کرکے حجاج کرام اپنے اپنے علاقوں اور ملکوں کی طرف روانہ ہونے لگے ہیں، یقیناان لاکھوں فرزندان توحید نے جن سخت ترین حالات اور شدید گرمی میں امسال فریضہ حج ادا کیا ہے اور کانپتے بدن کے ساتھ انتہائی اخلاص وفروتنی کے عالم میں اللہ رب العالمین سے دعائیں کی ہیں وہ بڑے ہی دل گردے کی بات ہے، میں دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں کہ انھوں نے رب العالمین کو پکارا ہوگا کہ!

''اے الٰہ العالمین!اس وقت تیری یہ حسین وجمیل سرسبز وشاداب دنیا شر وروفتن کی آماجگاہ بن چکی ہے، تیرے نام لیوا اور تیرے حبیب ومحبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) امت جسے تیری بے نیاز ذات نے آخرالامم بنایا ہے، پوری دنیا میں اپنے تاریخ کے بھیانک ترین دور سے گزر رہی ہے، مشرق تا مغرب اس امت محمدیہ کو ابتلاء وآزمائش کے انگاروں پر چلنا پڑ رہا ہے، اقوام عالم ان بے سہارا مسلمانوں پر خونخوار بھیڑیوں کو طرح ٹوٹی پڑی ہیں، مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ پر کھلے عام حملے ہورہے ہیں، ہر جگہ سے اسلامی آثار و معالم کو پامال کرنے اور شرک وکفر کی علامتوں کو زندہ کرنے کی تحریکیں چل رہی ہیں، ارتداد والحاد کی تیز وتند ہواؤں کے درمیان ایمان خالص کا ٹمٹماتا چراغ جو کسی حد تک روشنی دے رہا تھا اب سرعت کے ساتھ دم توڑنے لگا ہے مسلمانوں کی نئی نسل تیزی سے بے دینی کا شکار ہوکر ارتداد کی کھائی میں گرتی جارہی ہے، انبیاء ومرسلین کی وہ پاکیزہ سرزمین جس کو تو نے اپنی کتاب مبین میں خیر وبرکت کا مسکن قرار دیا، وہ ارض فلسطین آٹھ ماہ سے تیرے دشمنوں اور نافرمانوں کی دہکائی ہوئی آگ میں جل کر خاکستر ہورہا ہے، ہر نیا دن نئے شعلے برساتا ہے، ہر رات شدید بمباری کی آوازوں سے دل دہل دہل جاتے ہیں، بے گناہ ومعصوم مسلمانوں کی جان جاتی ہے، اربوں کھربوں کے اسباب واموال گولہ بارود کی گرمی سے پگھل کر تباہ ہوچکے ہیں، صوفیاء واتقیاء علماء صالحین کی دینی محنت کی سرزمین ارض ہند کے بائیس کروڑ مسلمانوں کا وجود وتشخص فرقہ پرستوں کے نشانہ پر ہے، ہر نیا سورج نئے خطرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔

بارالٰہا: یہ سال ہلاکتوں، بربادیوں، مصیبتوں، پریشانیوں، خطرات کے ساتھ گزرا ہے، بموں

کے دھماکے، مرنے والوں کی چیخوں، قحط زدہ مسلمانوں کی آہ وفغاں، بمبار جہازوں کی گڑگڑاہٹ، ٹینکوں، توپوں کی آوازوں، گولیوں کی بوچھاروں کے ساتھ گزرا ہے، الہ العالمین! ہم تو وہی کہیں گے جیسا کہ گذشتہ دور میں انبیاء علیہم السلام نے ان جیسے حالات میں صبر واستقامت کا پیمانہ لبریز ہونے کی حالت میں تجھے پکارا تھا اور کہا تھا متی نصر اللہ اللہ کی مدد کب آئے گی تب تیری بارگاہ سے فرمان جاری ہوا تھا اَلاَ اِنَّ نصر اللہ قریب۔

الہ العالمین وہی مژدہ جانفزا مسلمانان عالم کو پھر سنادے، اپنی نصرت واعانت فرما، آنے والا نیا ہجری سال مسلمانان عالم اور دنیائے انسانیت کے لئے امن وسکون، سہولت وراحت کا سامان بنادے، وحشت ناکی، مایوسی اور حرماں نصیبی سے پاک ایمانی صلابت اور عملی استقامت کا سال ہو، مشرق وسطیٰ میں ارض مقدس سے صہیونی قوتوں، امریکی طاقتوں کا نام ونشان مٹادے، مسلمانان ہند کو مایوسیوں کی دلدل سے نکال کران میں پھر سے وہی جوش وجذبہ پیدا کردے جس کی مثال ہمارے اسلاف نے پیش کی تھی، مسلمانوں کے بے جا اختلافات اور مسلکی تنازعات، خاندانی خلفشار سے ہم سب کو بچالے، اب ہمتیں ٹوٹ رہی ہیں، آرزوئیں دم توڑ رہی ہیں، وحدت امت کا شیرازہ بکھر رہا ہے، بے دینی وبدعملی کے سیاہ بادل دن بدن گھرے ہوتے جارہے ہیں ہماری معصوم نسل نو کا مستقبل ان حالات میں تاریک نظر آرہا ہے۔

بار الہا! تیرے حبیب ومحبوب کے دیار پاک میں، منی وعرفات کے میدانوں میں حرم مبارک کے صحن مبارک میں تیرے عظیم ترگھر بیت اللہ کے سامنے ہم یہ التجاء کررہے ہیں ہم اپنے اپنے وطن، ملک خاندان میں جب پہونچیں تو تیری برکتوں، رحمتوں، اور امت مسلمہ کی عزت ورفعت اور شان وشوکت کی سوغات لیکر پہونچیں۔

ہمارا نیا اسلامی سال، محبت واخوت، وحدت، مساوات، عزت وعظمت، سکون وراحت اور امن وامان کا سال ہو، یہی ہم سب شکستہ دل مسلمانوں کی صدائے دل ہے۔"

ہم آپ نئے اسلامی سال کی دہلیز پر کھڑے ہیں، اس موقع سے زندہ دل قوموں کی طرح ہمیں خود احتسابی سے کام لینا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ سالِ گذشتہ دینی ملی اور قومی لحاظ سے ہمارا کیسا گزرا، کیا ہم نے اپنے لئے کچھ ترجیحات متعین کی تھیں؟ ان پر کتنا عمل ہوا؟ اور اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے نئے اسلامی سال کے آغاز سے اب ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں اور انھیں ہم کس طرح بروئے کار لائیں کہ خاطر خواہ فائدہ ہو۔

ہر نیا سال دنیا کی تمام قوموں کے لئے نئے عہد وپیمان اور نئی امنگوں اور حوصلوں کا سال ہوتا ہے، ہر سال کی شروعات میں کچھ نئے عزائم کئے جاتے ہیں اور ازسرنو زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر کی جاتی ہے

، آئیے! ہم دیکھتے ہیں کہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے اس نئے سال پر ہماری ترجیحات اور عزائم کیا ہونے چاہئیں، کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا آدمی اپنے گزرے سال کا احتساب اور اگلے سال کی منصوبہ بندی ضرور کرتا ہے، تبھی یہ ممکن ہوتا ہے کہ گزرے ایام میں جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں، ان سے آئندہ بچا جاسکے، نیز گزشتہ سال جن اہداف کو حاصل نہ کیا جاسکا، آئندہ سال ان اہداف کے حصول کی کوشش اور جدو جہد کو اور بڑھا دیا جائے، زندگی کی گاڑی تبھی آگے بڑھتی اور انسان ترقی کر پاتا ہے۔

انسانی زندگی کی مختلف جہات ہیں، لیکن اس کی زندگی کا سب سے اہم پہلو وہ ہے جو اسے رب سے جوڑتا اور اس کی روح کو جلا بخشتا ہے، اس میں خود احتسابی اور معرفت خداوندی کا احساس جگاتا ہے، آج شاید مسلمانوں کی توجہ اسی جہت پر سب سے کم ہے۔ نتیجہ مسلمانوں کا ہر معاملے میں خواہ وہ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی مسئلہ ہر جگہ رب سے تعلق انتہائی کمزور اور مجموعی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے، مسلم معاشرے میں اسلام کا صرف نام ہی نظر آتا ہے، عملی اور اطلاقی حیثیت میں دین اپنی روح کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہے، دوسری جانب حکم ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلام تو محض نام کا ہے اور شیطان کی پیروی میں لوگ آگے ہیں۔ آج مسلمانوں کا طرزِ حیات تقریباً اسلام سے کوسوں دور ہے، قرآن جب پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کی بات کرتا ہے تو وہ دراصل سو فی صدی اسلام کا تقاضا کرتا ہے، یعنی اللہ کے ساتھ ایک مسلمان کا معاملہ فرماں بردارانہ، مطیعانہ، اور مکمل ہونا چاہیے، عقائد میں بھی، فرائض و عبادات میں بھی، طرزِ معاشرت میں بھی، طریقہ زندگی میں بھی، مسلمان کو اپنے ہر عمل کے ذریعے یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کیا اس کا یہ عمل اس کے تعلق کو مضبوط کر رہا ہے یا نہیں!

آج پوری امت بہت ساری مشکلات و مصائب میں گھری ہوئی ہے، مسلم قوم کا جینا دوبھر ہو رہا ہے، وجہ اس کی کیا صرف یہ ہے کہ دشمنان اسلام نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، ہر ہر مرحلۂ حیات پر سازشوں اور دسیسہ کاریوں کے جال تان دیئے گئے ہیں؟ نہیں، نہیں! وجہ صرف یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک وجہ اور بھی ہے جس کی طرف ہماری غفلت شعار طبیعت متوجہ نہیں ہونے دیتی، آئیے اس نئے سال کے آغاز پر اسی پہلو کو اجاگر کر کے نئے عہد و پیمان سے نیا سال شروع کرتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں پانچ

چیزوں سے کہ تم ان کو پاؤ، جب کسی قوم میں فحاشی (شراب نوشی بدکاری ناچ گانا وغیرہ) اعلانیہ ہونے لگے تو وہ طاعون اور ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوگی جو ان سے پہلے لوگوں میں کبھی نہ ہوئی تھیں، جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی (تجارتی بدعنوانیاں، چور بازاری وغیرہ) کرنے لگے تو وہ قحط مصیبت اور ظالم حکمرانوں کے ظلم کا شکار ہوجائے گی، جو قوم زکوۃ نہیں دیتی تو اللہ تعالیٰ ان سے بارانِ رحمت روک دیتا ہے، اگر جانور نہ ہوں تو کبھی ان پر بارش نہ ہو، جب مسلمان اللہ اور اس کے رسول سے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہیں گے تو اللہ تعالیٰ غیر قوم سے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کردیتا ہے جو ان کے مال (دولت ،تجارت اور زراعت وغیرہ) کو زبردستی چھین لیں گے، جب اہل حکومت اللہ کی کتاب (قرآن کریم) کے مطابق فیصلہ کرنا چھوڑ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں لڑائی کرادیتا ہے (یہاں تک کہ خانہ جنگی ہوجائے)۔(شعب الایمان للبیہقی)

قوم مسلم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ آج اپنے گھر کے روشن سورج کو چھوڑ کر غیروں کے ٹمٹماتے چراغ سے روشنی حاصل کرنے کو باعث افتخار سمجھتے ہیں، اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھئے اور اس میں ہجری سال کی تاریخ کے باب پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کا طریقۂ کار نئے سال کے استقبال پر کیا رہا ہے۔ اسلامی ہجری سال کا پہلا مہینہ محرم ہے جس میں روزہ رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے، اور مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ سنت نبوی کا اتباع کرتے ہوئے نو اور دس یا دس اور گیارہ محرم کا روزہ رکھیں، روزہ جہاں ایک طرف ہمیں برائیوں سے دور کرتا ہے وہیں دوسری طرف ہمیں خود احتسابی کے لئے بھی تحریک دیتا ہے، ہمیں ہماری ذمہ داریوں کی یاد دہانی کراتا ہے، اسلامی ہجری سال کے استقبال کے اس طریقۂ کار سے نہ صرف یہ کہ ہماری زندگیوں میں متوقع مثبت تبدیلی آتی ہے بلکہ یہ ہماری زندگیوں میں خوشحالی وترقی کیلئے بھی راہ ہموار کرتا ہے، اسلامی نظام وقتی ومصنوعی خوشیوں کی طرف رہنمائی نہیں کرتا بلکہ یہ انسانی زندگیوں میں سچی خوشیوں اور سکون کا قائل ہے اور یہ سچی خوشیاں و سکون خودغرضی، فریب، فحاشی وعریانیت سے اجتناب کرکے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آئیے...! اس نئے اسلامی سال کی ابتدا پر یہ عزم کریں کہ اس سال رب سے اپنے تعلق کو مضبوط کریں گے اور اللہ کے اس حکم پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کہ "اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ!"

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں!
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

درسِ قرآن

جھوٹ کی سواری

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی خیرآبادی

لاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً۔ (بنی اسرائیل ۳۶)

اے رسول جس بات کا آپ کو علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ پڑیئے، بے شک کان، آنکھ اور دل (تو) اس سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر کرتے ہیں کہ:

”آدمی کو چاہئے کہ کان، آنکھ اور دل ودماغ سے کام لے کر اور بقدر کفایت تحقیق کر کے کوئی بات منھ سے نکالے یا عمل میں لائے، سنی سنائی باتوں پر بے سوچے سمجھے یوں ہی اٹکل پچو کوئی قطعی حکم نہ لگائے یا عمل درآمد شروع نہ کر دے، اس میں جھوٹی شہادت دینا، غلط تہمتیں لگانا، بے تحقیق چیزیں سن کر کسی کے درپے آزار ہو جانا یا بغض وعداوت قائم کر لینا، باپ دادا کی تقلید یا رسم ورواج کی پابندی میں خلاف شرع اور ناحق باتوں کی حمایت کرنا، ان دیکھی یا ان سنی چیزوں کو دیکھی یا سنی بتانا، غیر معلوم اشیاء کی نسبت دعویٰ کرنا کہ میں جانتا ہوں، یہ سب صورتیں اس آیت کے تحت داخل ہیں، یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن تمام قویٰ کی نسبت سوال ہوگا کہ ان کو کہاں کہاں استعمال کیا ہے، بے موقع تو خرچ نہیں کیا۔“ (تفسیر عثمانی بر حاشیہ ترجمہ شیخ الہند)

آج ہمارا حال یہی ہے کہ اڑانے والے بے پر کی اڑا دیتے ہیں اور لوگ اس پر اعتماد کر کے اسے نقل کرنے لگتے ہیں، اور بسا اوقات آدمی خود ایک بات کہتا ہے، لیکن الزام سے بچنے کا آسان طریقہ یہ بنالیتا ہے کہ اسے دوسروں پر ڈال دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں، لوگوں سے سنا ہے، یہ لفظ جھوٹ کی سواری ہے، اس سواری پر جھوٹ پھیلتا چلا جاتا ہے، شاید ہی کوئی محفل ایسی ہو جس میں کسی کی ذات وصفات پر تبصرہ نہ ہوتا ہو، اور سننے والے بغیر تحقیق کے اسے قبول کر لیتے ہیں، اور بے تکلف اسے پھیلانے لگتے ہیں اور اسے اتنے وثوق سے بیان کرتے ہیں جیسے پوری طرح ان کو اس کا ذاتی علم ہو، اگر پوچھا جائے

کہ جناب کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں تو سند یہ پیش کریں گے کہ ’’لوگ کہتے ہیں‘‘ یہ لوگ کون ہیں؟ کیا ان کا قول معتبر ہے؟ گویا اب اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، اس دور میں ہمارا جو حال ہے اس پر اللہ کے رسول صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی یہ حدیث بالکل صادق آرہی ہے:

بئس مطية الكذب "يقول الناس" ۔(احیاءعلوم الدین للغزالی)

جھوٹ کی سب سے بری سواری یہ ہے کہ کہا جائے کہ ’’لوگ کہتے ہیں‘‘۔

ہمارے معاشرے کو دوسروں کی کھال میں الجھنے کا اتنا شوق ہے کہ عموماً لوگ اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں کہ کون کیا کرتا ہے؟ کیا باتیں کرتا ہے؟ کن لوگوں سے ملتا ہے؟ اور کیوں ملتا ہے؟ اگر کچھ باتیں جان لیتے ہیں تو اس میں اپنی طرف سے سو ملا کر ایک دوسرے کو سناتے ہیں، پھر وہ لوگ سنی سنائی باتوں کو دوسروں سے نقل کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے، حالاں کہ اس موضوع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: **كفى بالمرء كذباً أن يحدث بكل ما سمع**۔ (رواہ مسلم)

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرتا پھرے۔

حالاں کہ اگر کسی کے بارے میں کوئی خبر دے تو پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کہنے والے کا معاشرہ میں اور اسلامی شریعت کے نزدیک کیا مقام ہے؟ وہ قابل اعتماد ہے کہ نہیں؟ اس کی باتوں کو صحیح مانا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ قرآن کہتا ہے: **إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا**۔

اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر آدمی خبر لے کر آئے تو پہلے اس کی تحقیق کرلو (پھر اعتبار کرو اور بیان کرو)۔

لیکن ایسا ماحول بن چکا ہے کہ ادھر بات سنی ادھر بدظن ہو گئے، اور اپنی اس بدظنی پر اتنا اعتماد ہے کہ صاحب معاملہ خود صفائی دے تب بھی کہیں گے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، اللہ اکبر! یہ حال ہے اپنے گمان باطل پر ڈٹے رہنے کا، حالاں کہ ارشاد ربانی ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ**۔ اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان سے بچو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہیں۔

آپس کی ناچاقی، ایک دوسرے سے بداعتمادی بلکہ باہمی نفرت میں بڑا دخل، بدظنی اور بلاوجہ ایک دوسرے کے پیچھے پڑے رہنے کا ہے، کسی کو کسی سے بات کرتے دیکھا ایک رائے قائم کرلی، کسی کو اپنے مخالف کے ساتھ دیکھا تو بدظن ہو گئے، محض اپنے دلی حسد سے مجبور ہو کر کسی کے تجارتی راز جاننے، کسی کے

اندرونی معاملات کو کریدنے اور محض قیاس کی بنیاد پر کسی کے بارے میں بات پھیلانے کا مرض بھی ہمارے معاشرے میں عام ہے، ذرا ہم صدق دل سے اپنے حالات پر، اپنی دلی بیماریوں پر غور کریں پھر اس اہم آیت **لَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ** پر غور کریں، کیا یہ آیت ہم پر فٹ نہیں ہوتی، ہم سوچیں کہ کیا ایک مؤمن کامل کی صفات ہم میں موجود ہیں جو معاشرہ کی اچھائی اور صفائی کا باعث ہوتا ہے، یا بس نام کے مسلمان ہیں۔

کان آنکھ دل سے سوال کی تخصیص کیوں؟

آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ بے شک کان آنکھ اور دل سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گیا، اس کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس سلسلہ میں مفتی اعظم محمد شفیع صاحبؒ: معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہاں کان، آنکھ اور دل کی تخصیص شاید اس بنا پر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ حواس اور دل کا شعور وادراک اسی لیے بخشا کہ جو خیال یا عقیدہ دل میں آئے ان حواس اور ادراک کے ذریعہ اس کو جانچ سکے کہ یہ صحیح ہے تو اس پر عمل کرے اور غلط ہے تو باز رہے، جو شخص ان سے کام لئے بغیر بے تحقیق باتوں کی پیروی میں لگ گیا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی۔''
>
> (معارف القرآن، ۵/ ۴۸۳، معراج بکڈپو دیوبند)

اگر ہم غور کریں تو کان اور آنکھ ہی وہ آلے ہیں جن سے انسان باتوں کو سنتا ہے، چیزوں کو دیکھتا ہے، اور کان سنی ہوئی بات کو دل ودماغ تک پہونچاتا ہے، آنکھ دیکھی ہوئی چیزوں سے دل ودماغ کو باخبر کرتی ہے، اور دل ودماغ فیصلہ کرتے ہیں گویا حقائق کی جانکاری اور فیصلہ اور اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کی معرفت کے بنیادی ذرائع یہی تینوں آلے ہیں، اگر انسان محض سن کر یا دیکھ کر عقل وخرد کو کام میں لائے بغیر رائے قائم کر لیتا ہے یا فیصلہ کر دیتا ہے تو اس نے عقل ودماغ کا صحیح استعمال نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی سے بدظن ہو گیا، کسی پر تہمت لگائی، کسی سے نفرت پیدا کر لی جب کہ یہ بدظنی، تہمت اور نفرت بے بنیاد ہے، حقیقت کچھ اور ہے کیوں کہ جس چیز کو آنکھ نے دیکھا یا کان نے سنا وہ محض ظاہری پہلو ہے، اس کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟ وہ تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی۔

طابع، ناشر، مدیر (مولانا) محمد عاقل (صاحب) ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے
سبھاش پرنٹنگ پریس نواب گنج چوک سہارنپور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور سے شائع کیا

انوار حدیث

نامحرم عورت سے تنہائی میں ملنا

مولانا محمد خالد سعید مبارکپوری
استاذ حدیث مظاہر علوم سہارنپور

وَ مَن کانَ یُؤمِنُ بِاللّٰہِ والیومِ الآخِرِ فَلایَخلُوَنَّ بِامْرَأۃٍ لَیسَ مَعَھَا ذُو مَحرَمٍ مِنھا، فإنَّ ثالِثَھُمَا الشیطانُ"(مسند احمد ۳/۳۳۹)

اور جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ کسی ایسی (نامحرم) عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور تنہائی میں نہ ملے جس کے ساتھ اس کا محرم نہ ہو، کیوں کہ اس صورت میں ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔(مسند احمد)

اسلام میں عفت وعصمت کی بہت ہی زیادہ اہمیت ہے، اور اس کی حفاظت کی بڑی تاکید آئی ہے، اسلام نے معاشرے کو اخلاقی برائیوں اور بے حیائیوں سے پاک صاف رکھنے کے لیے بڑے اہم اور واضح احکامات دیے ہیں، انھیں احکامات میں سے ایک حکم یہ ہے کہ کوئی مرد کسی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اور تنہائی میں اس سے نہ ملے کیونکہ کوئی مرد جب کسی نامحرم عورت سے تنہائی میں ملتا ہے اور وہاں عورت کا یا مرد کا کوئی محرم موجود نہیں ہوتا تو شیطان مرد اور عورت کے دلوں میں برائی اور گناہ کے خیالات پیدا کرتا ہے اور بسا اوقات انھیں معصیت اور گناہ میں مبتلا بھی کر دیتا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خلوت اور تنہائی اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے شیطان کو گناہ میں مبتلا کرنے کا موقع ملے۔

مَحرَم: عورت کا محرم وہ قریبی شخص کہلاتا ہے جس سے اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، یہ تابیدی یعنی ہمیشگی کی حرمت کبھی نسب کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے باپ، بیٹا، بھائی، چچا وغیرہ سے نکاح کا حرام ہونا، اور کبھی سبب یعنی رضاعت یا مصاہرت کی وجہ سے مثلاً منکوحہ اور موطوءہ کے اصول وفروع سے نکاح کا حرام ہونا (دیکھئے فتاوی شامی ۹/ ۶۰۵)

بہر حال عورت کے ساتھ اس کا کوئی محرم ہو یا مرد کا کوئی محرم موجود ہو تو یہ خلوت (جو حقیقت میں

خلوت اور تنہائی ہے ہی نہیں) ممنوع نہیں ہے، اسی طرح شوہر کی موجودگی میں عورت کے پاس بیٹھنا بھی خلوت ممنوعہ میں داخل نہیں ہے، لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ممنوع نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شوہر یا محرم کی موجودگی میں عورت کے لیے اجنبی اور نامحرم آدمی کے سامنے بے پردہ ہوکر آنا اور اس کے ساتھ گھل مل جانا درست ہے، بلکہ پردے اور حجاب وغیرہ سے متعلق شرعی حدود وضوابط کی پابندی اس وقت بھی ضروری ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کوئی اجنبی (نامحرم) مرد کسی نامحرم عورت سے اس طرح ملے کہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا نہ ہو تو یہ باتفاق علماء حرام ہے اور یہی حکم اس صورت میں بھی ہے کہ ان دونوں کے ساتھ دو تین سال کا بچہ ہو، جس سے شرم نہیں کی جاتی، کیوں کہ ایسے بچے کی موجودگی عدم موجودگی ہی کے حکم اور درجے میں ہے، اور ایسے ہی اگر چند مرد کسی اکیلی نامحرم عورت کے پاس جمع ہوجائیں تو یہ بھی حرام ہے، اس کے برخلاف اگر ایک مرد اور کئی نامحرم عورتیں اگر کسی جگہ اکٹھا ہوجائیں تو صحیح قول یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہے۔ (شرح مسلم للنووی ۱/ ۴۳۴)

عالم، پیر، ڈاکٹر وغیرہ کے ساتھ بھی نامحرم عورت کی خلوت حرام ہے

حدیث شریف سے صاف صاف معلوم ہوگیا کہ کسی مرد کے لیے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا، عالم ہو، یا جاہل، نیک ہو یا بد، کسی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت اور تنہائی جائز نہیں ہے، حتی کہ اگر کوئی شخص انتہائی متقی و پرہیزگار یا پیر و مصلح ہو تب بھی اس کے لیے نامحرم عورت کے ساتھ خلوت اور تنہائی جائز نہیں، کیونکہ شیطان ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے اور کوئی بھی اس کے وسوسوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بہت سی نامحرم عورتیں اپنے جاہل پیروں کے پاس تنہائی میں جاتی ہیں اور خلوت میں ملتی ہیں، یہ عورتیں اور ان کے گھر والے اپنی جہالت کی وجہ سے اور پیر صاحب کی اندھی عقیدت کی بنا پر اس کو نہ تو معیوب سمجھتے ہیں، اور نہ ہی گناہ، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس پرست جاہل پیر، ان نامحرم عورتوں کو اپنے نفس اور ہوس کا شکار بناتا ہے، اور مرد و عورت دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک اور شریعت کے حکم کی سراسر خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے ڈاکٹر مریض کو الگ کمرے یا کیبن میں اس طرح دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اور مریض دونوں دوسرے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں اس صورت میں بھی ڈاکٹر کی نامحرم مریضہ کے ساتھ خلوت

حرام ہے، ایسے ہی تعویذ گنڈہ کرنے والے بعض عامل نامحرم عورتوں کے ساتھ خلوت اختیار کرتے ہیں ان تمام صورتوں میں مرد اور عورت دونوں گنہ گار ہوں گے۔

خلوت کی جائز صورت

البتہ اگر کوئی نامحرم عورت کسی عالم، مفتی یا ڈاکٹر وغیرہ سے اپنی بات تنہائی میں اس طرح کہنا چاہے کہ دوسرے لوگ اسے نہ سن سکیں تو اس کی جائز صورت یہ ہے کہ وہ اپنی بات ان نامحرم مردوں سے ایسی جگہ میں کہے جہاں دوسرے لوگ بھی ہوں لیکن ان لوگوں سے اتنا فاصلہ اور دوری ہو کہ وہ لوگ اس عورت کی بات نہ سن سکیں البتہ اس عورت کو اور جس نامحرم سے وہ بات کر رہی ہے اس کو وہ لوگ دیکھ رہے ہوں، اور یہی صورت ایک دوسری حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

''جاءَتْ اِمْرَأَةٌ مِن الأنصارِ إلى النبيِ صلى الله عليه وسلم فَخَلَا بِهَا فقال: وَ اللهِ اِنَّكُنَّ لَأَحَبُّ الناسِ إليَّ'' (رواہ البخاری ۲/۷۸۷) انصار کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بعض راستوں میں) اس عورت کے ساتھ تنہائی اختیار فرمائی، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ (انصار اور ان کی عورتیں) میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض طرق میں ''فَخَلَا بِهَا فِي بَعضِ الطُرُقِ أو في بَعضِ السِّكَكِ'' وارد ہوا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے ساتھ ایسے چالو راستے پر خلوت فرمائی جہاں عموماً لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی، (فتح الباری ۹/۴۱۶)

اور بخاری (۱/۵۳۴) پر اسی حدیث کے دوسرے طریق میں ہے کہ ''وَ مَعَهَا صَبِيٌّ لَهَا'' عورت کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا، اور خود حضرت انسؓ نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا مگر انھوں نے عورت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو کو نہیں سنا، ہاں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری جملہ سنا تھا، جس کو نقل فرما دیا ہے، اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے بھی اس حدیث پر ترجمۃ الباب ان الفاظ کے ساتھ قائم فرمایا ہے: ''بابُ مایجوز أن یخلوَ الرجلُ بالمرأةِ عندالناسِ'' (لوگوں کے پاس عورت کے ساتھ مرد کے خلوت اختیار کرنے کے جواز کا بیان) اس ترجمۃ الباب میں ''عندالناس'' کے اضافے سے امام بخاریؒ اسی بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں، کہ عورت کے ساتھ مرد کے خلوت اختیار کرنے کی صورت میں ان دونوں کی ذات لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے۔

لائحۂ عمل

دینی مدارس اور موجودہ حالات

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

ہندوستان میں انگریزوں نے اقتدار کی مدت کو طویل تر کرنے، اپنے قبضہ کو مستحکم کرنے اور مستقل طور پر ہندوستان کو اپنے زیر قبضہ رکھنے کے لئے سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کی جدو جہد شروع کر دی؛ اگر چہ عیسائی مشنری کا نشانہ ہندو اور مسلمان دونوں تھے؛ لیکن ہندوؤں کی پست اقوام میں ان کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اور مسلمان ان کے عزم وارادہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے؛ اس لئے انھوں نے اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات والا صفات، اسلامی قوانین اور قانون شریعت کے مصادر قرآن وحدیث نیز مسلمانوں کی تاریخ کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا اور حد یہ ہے کہ اس کام کے لئے دروغ گوئی کرنے، جھوٹ بولنے اور لکھنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیا، مزید ستم یہ ہوا کہ آریہ سماجی فرقہ نے بھی مسلمانوں کی مخالفت میں فکری اعتبار سے ان کی مدد کی، اب مسلمان ایک طرف انگریزوں سے نبرد آزما تھے اور دوسری طرف آریہ سماجیوں سے، اس صورت حال میں اللہ کے کچھ نیک بندوں نے ایک نسخۂ کیمیا دریافت کیا، یہ نسخہ تھا حکومت کی مدد اور اس کے اثر سے آزاد دینی مدارس کا قیام، اُن کا احساس تھا کہ مدارس ایک ایسا فکری کارخانہ ثابت ہوں گے، جن سے تسلسل کے ساتھ تحفظ اسلام کے لئے افرادی قوت حاصل ہو سکے گی، جو اسلام کی ترجمانی اور دفاع کا فریضہ پوری قوت اور دینی غیرت وحمیت کے ساتھ انجام دیں گے اور حکومت کے اثر سے آزاد ہونے کی وجہ سے کوئی طاقت ان کے ضمیر کا سودا نہیں کر سکے گی، اسی جذبہ کے تحت دارالعلوم دیوبند اور مختلف مدارس کا قیام عمل میں آیا، اسی زمانہ میں جنوبی ہند میں باقیات الصالحات اور جامعہ نظامیہ کا قیام عمل میں آیا، اور چوں کہ اس کوشش کے پیچھے بھر پور اخلاص کا جذبہ کارفرما تھا؛ اس لئے یہ پودے تناور ہوتے گئے اور ہندوستان ہی نہیں ہندوستان سے باہر بھی اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔

ان مدارس کے ذریعہ اس طویل وعریض ملک میں اسلامی تعلیمات کی حفاظت، مسلم معاشرہ کو دین سے

مربوط رکھنے، گمراہ کن افکار سے ان کو بچانے، اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے شبہات واعتراضات کا دفاع جیسی ذمہ داریوں کو انجام دیا گیا؛ چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اس ملک میں جو کچھ بھی اسلامی تشخصات نظر آتے ہیں، وہ ان ہی کوششوں کے اثرات ہیں، موجودہ حالات بعض جہتوں سے تقریباً اسی طرح ہیں جو برطانیہ کے غلبہ کے وقت پیدا ہوئے تھے، آج بھی اسلامی تشخصات کو نقصان پہنچانے کی سعی سیاسی پارٹی ہی نہیں بلکہ خود حکومت کی طرف سے اعلانیہ طور پر کی جارہی ہے، مسجدوں کو صنم خانوں میں بدلنے کی منظم کوشش ہورہی ہے، اسلامی شعار کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، شہروں، محلوں اور سڑکوں کے نام تبدیل کئے جارہے ہیں، ملک کی تاریخ ازسرنو لکھی جارہی ہے، افسوس کہ جس قوم نے ملک کی آزادی کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، اُن سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ مانگا جارہا ہے، علماء ومدارس جو آزادی کی لڑائی میں پیش پیش تھے، ان کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کئے جارہے ہیں، اور جن لوگوں کو آزادی کی لڑائی میں ایک کانٹا بھی نہیں چبھا، اُن کو ملک کا ہیرو قرار دیا جارہا ہے؛ اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی میں مدارس کی جو ضرورت واہمیت تھی، آج اس سے بڑھ کر ہے؛ اس لئے مدارس کا تحفظ، ان کا استحکام اور ان کو مفید تر بنانے کی کوشش پوری ملت اسلامیہ ہند کا فریضہ ہے۔

اس وقت ملک کی بعض ریاستوں میں مدارس کے سروے کے نام سے جو بات کہی جارہی ہے، اس کا مقصد واضح طور پر مسلمانوں کو رسوا کرنا اور ان کو برادران وطن کی نظر میں مشکوک بنانا ہے، اگر حکومت جاننا چاہتی ہے کہ تعلیمی ادارے حکومت کے اصول وضوابط پر عمل پیرا ہیں یا نہیں؟ تو اس کو جاننے کی ضرورت صرف مدارس ہی کو نہیں ہے، تمام تعلیمی اداروں میں ہے، چاہے وہ اکثریتی فرقہ کے تعلیمی مراکز ہوں یا اقلیتوں کے، اور اقلیتوں میں مسلمانوں کے ہوں یا سکھوں کے، عیسائیوں کے یا بدھسٹوں کے؛ بلکہ پرائیویٹ اداروں سے زیادہ سرکاری اداروں کا سروے کرنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ حکومت کے قواعد وضوابط کے مطابق اسکولوں کے لئے جو انفراسٹرکچر ہونا چاہئے وہ مہیا ہے یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں حکومت کا بھی احتساب ہونا چاہئے، صرف مسلمانوں کے تعلیمی اداروں یا دینی مدرسوں کا سروے مسلمانوں کے خلاف شکوک وشبہات کا موقع پیدا کرتا ہے، اور اس وقت نفرت کی جو آندھی آئی ہوئی ہے، یا لائی جارہی ہے، اس میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے؛ اس لئے مسلمانوں اور مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اس کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے؛ کیوں کہ آزاد مدارس مسلمانوں کا اپنا اثاثہ ہیں، اس کی زمین، اس کی عمارت، اس کا فرنیچر، اس کی لائبریری وغیرہ میں

حکومت کا کچھ نہیں ہے، یہ مذہبی اوقاف کے درجہ میں ہے، اگر کوئی بات قابل تحقیق ہو تو اس کی تحقیق تو کی جاسکتی ہے؛ لیکن سروے کے نام سے ان کو خوفزدہ کرنا یا مدرسہ کی املاک کو اپنی تحویل میں لے لینا سراسر ظلم وزیادتی ہے؛ اس لئے ایک طرف ہمیں حکومت کے اس اقدام کی مزاحمت بھی کرنی چاہئے دوسری طرف ہمیں مناسب تدبیریں بھی اختیار کرنی چاہئیں، اس وقت ان ہی تدابیر کے بارے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:

الف : قانونی جہت سے جو کوتاہیاں ہوں، ان کو دور کرنا ضروری ہے، ہندوستان میں عام مزاج یہ ہے کہ اگر کمرشیل بلڈنگ نہ ہو تو تعمیر کی باضابطہ اجازت حاصل نہیں کی جاتی، مسجد ہو یا مندر چرچ ہو یا گرودوارہ، اوران کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارے، ان کی تعمیری اجازت لینے کا اہتمام نہیں کیا جاتا، اب یہ ضروری ہے کہ دینی مدارس تعمیر سے پہلے نقشہ پیش کرکے ادارہ مجاز سے اس کی باضابطہ اجازت حاصل کریں، اور اگر عمارت بن چکی ہے تو ضابطہ کے مطابق جرمانہ ادا کرکے اس کی توثیق کرائیں، یہ عمارت بچانے کا کام ہے، جس کی اہمیت عمارت بنانے سے زیادہ ہے؛ اس لئے اس کو فضول اور بے کار نہ سمجھا جائے۔

ب : قانونی جہت سے دوسرا اہم کام حسابات کو حکومت کے مقرر کئے ہوئے اصول وضوابط کے مطابق لکھنا اور محفوظ رکھنا ہے، بحمد اللہ مدارس میں جو بھی آمدنی ہوتی ہے اور جو کچھ خرچ ہوتا ہے، اس میں پوری دیانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور حساب وکتاب میں پوری احتیاط برتی جاتی ہے؛ لیکن رقم کی وصولی اور خرچ کے لئے کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ہدایت کے مطابق حسابات کو لکھنا چاہئے، مقررہ ضابطوں پر عمل ہونا چاہئے، پوری شفافیت کے ساتھ حسابات کو آڈٹ کرانا چاہئے اور حساب اس طرح رکھنا چاہئے کہ دیکھنے والے بھی مطمئن ہوں اور اپنے ضمیر کو بھی اطمینان ہو۔

ج : قانونی جہت سے کرنے کا ایک کام یہ بھی ہے کہ ہر ادارہ اپنے لئے ایک مشیر قانونی مقرر کرے، جو ٹیکس کے شعبہ سے تعلق رکھنے والا وکیل ہو تو زیادہ بہتر ہے، وہ مدرسہ کی املاک اور آمد وصرف پر گہرائی کے ساتھ نظر رکھے اور بوقت ضرورت سرکاری محکموں میں حسابات کو پیش کرے، اس میں ایک شخص کی تنخواہ تو بڑھ جائے گی؛ لیکن نظم وضبط قائم رکھنے میں مدد ملے گی، اور مدارس کا تحفظ ہوگا، جو ذمہ داران مدارس حساب وکتاب کے فن سے واقف نہیں ہیں، نہ ٹرسٹ یا سوسائٹی وغیرہ کے اصولوں سے آگاہ ہیں، وہ نہ عوام کو مطمئن کرپاتے ہیں، نہ سرکاری محکموں کو، اور وہ دوہری دشواری اور شرمندگی سے دوچار ہوتے ہیں؛ اس لئے جہاں دیگر عہدہ دار ہوتے ہیں، ایک عہدہ "مشیر قانونی" کا ہونا چاہئے خواہ وہ اعزازی طور پر کام کرے یا ان کو اس کی فیس ادا کرنی پڑے۔

ج : مسلمانوں کو دستور نے جو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی آزادی دی ہے، اس کے تحت مدارس کا رجسٹریشن ضروری نہیں ہے؛ مگر رجسٹریشن سے متعدد فائدے ہیں، اور ایک اہم بات یہ ہے کہ اس سے بے جا شکوک وشبہات کا سد باب بھی ہوتا ہے؛ اسی لئے اگر ٹرسٹ یا سوسائٹی کے تحت مدارس کا رجسٹریشن کرلیا جائے تو یہ بہتر شکل ہوگی، رجسٹریشن ٹرسٹ کے تحت ہو یا سوسائٹی کے تحت، اس کے لئے قانون دانوں سے مشورہ کرلینا چاہیئے، اور اگر سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کرایا گیا ہو تو پھر مقررہ وقت پر اس کی تجدید بھی ضروری کرنی چاہیئے۔

۲۔قانونی جہتوں کی تکمیل کے بعد دوسرا ضروری کام ہے مدارس کے اندرونی نظام کی اصلاح، اس پر بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، اس سے متعلق چند اہم نکات یہ ہیں:

الف : مدرسہ شخصی نہ ہو؛ بلکہ ایک رجسٹرڈ انتظامیہ کے تحت ہو، یہ تو ہوسکتا ہے کہ انتظامیہ ہم مزاج لوگوں پر مشتمل ہو؛ تاکہ اختلاف وانتشار سے محفوظ رہے؛ لیکن یہ نہ ہو کہ ادارہ ایک شخص کی ملکیت بن کر رہ جائے، اس سلسلے میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، یہاں تک کہ بعض مدارس میں ایسا بھی ہوا کہ ذمہ دار ادارہ کی وفات کے بعد ان کے ورثہ نے مدرسہ کی املاک پر ملکیت کا دعویٰ کر دیا اور ادارہ ایک بڑے انتشار کا شکار ہو گیا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے لئے جو اُصول مقرر کئے، اس میں بھی شورائیت کو بڑی اہمیت دی گئی؛ لیکن اب ہمارے بیشتر مدارس شخصی آمریت کا نمونہ بن گئے ہیں، جس میں نہ کوئی مجلس انتظامی ہے اور نہ اہم امور پر مشورہ کا کوئی نظام، یہ بہت افسوسناک بات ہے اور حضور علیہ السلام کی سنت کے بھی خلاف ہے۔

ب : مدارس کی رہائش اور خورد ونوش کے انتظام میں بھی اصلاح کی بہت ضرورت ہے، طلبہ کی تعداد بڑھانے اور عمارتوں کی چکا چوند دکھانے سے زیادہ ہمیں طلبہ کی رہائش اور کھانے پینے کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے، یہ تو ظاہر ہے کہ مدارس عوامی چندوں سے چلتے ہیں، یہ کمرشیل ادارے نہیں ہیں، اکثر کچھ بڑے مدارس کو چھوڑ کر مقروض رہتے ہیں؛ اس لئے اس میں کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معیار کو ایک حد تک ہی بہتر بنایا جاسکتا ہے؛ لیکن جتنا کیا جاسکتا ہو اتنا ضرور کرنا چاہیئے، طلبہ کے لئے چارپائی یا تخت کا انتظام، کمروں کی وسعت اتنی ہو کہ بچے آرام سے رہ سکیں، روشنی اور پنکھے کا مناسب انتظام، پینے کے لئے صاف ستھرا پانی، کھیل کے لئے میدان، طبعی ضروریات کے لئے مناسب سہولت اور صفائی کا نظم، کھانے میں

بہتری کی کوشش، جو اشیاء پکائی جائیں وہ سڑی گلی مضر صحت نہ ہوں، یہ سب بنیادی ضرورتیں ہیں، ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، طلبہ کی لازمی ضروریات میں ان کی تعلیم کے مناسب حال کتب خانہ بھی شامل ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ اساتذہ اور ذمہ داروں کا طلبہ کے ساتھ طرز تخاطب بہتر اور مشفقانہ ہو۔

ج : مدارس میں حفاظتی انتظام کے لئے بھی بہتر اقدام کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں دو باتیں بہت اہم ہیں: اول یہ کہ مدرسہ کے گیٹ پر چوبیس گھنٹے دربان کا انتظام ہو، جو باہر سے آنے اور جانے والوں کا ریکارڈ رکھے، دوسرے: سی سی کیمرے کا ایسا انتظام ہو جو کہ پورے مدرسہ کا احاطہ کرتا ہو، اس میں باب الداخلہ، دفاتر، مسجد، کلاس رومس اور راستے سب شامل ہیں؛ تاکہ اگر کسی طالب علم یا کارکن کی تفتیش مطلوب ہو یا پولیس اس کے بارے میں جاننا چاہے تو اس کا ریکارڈ مہیا کیا جا سکے، یہ قانونی طور پر ضروری ہے، اس کے علاوہ یہ کیمرہ چوروں، اُچکوں اور غیر سماجی لوگوں سے بھی تحفظ کا ذریعہ بنے گا، ہر انسان کے لئے اپنی طاقت واستطاعت کے مطابق اپنی جان، املاک اور عزت وآبرو کی حفاظت ضروری ہے؛ اس لئے حفاظتی تدابیر پر خصوصی توجہ دینی چاہئے۔

بہر حال ایک طرف ہمارا فریضہ ہے کہ حکومت کی طرف سے دینی تعلیم گاہوں کے خلاف کئے جانے والے امتیازی سلوک کی پوری قوت وحکمت کے ساتھ مزاحمت کریں؛ کیوں کہ یہ دستور میں دئیے گئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور دوسری طرف خود مدارس کے نظام میں جن اصلاحات کی ضرورت ہے، پوری فراخدلی اور وسعت نظری کے ساتھ ان پر توجہ دیں اور نظام تعلیم وتربیت اور انتظام وانصرام کو مفید تر بنائیں!!!

خاص خاص گناہوں پر خاص خاص عذاب:

۱— ناپ تول میں کمی کرنے سے ظالم وجابر حکمراں مسلط کردئے جاتے ہیں۔
۲— زکوٰۃ نہ دینے سے بارش روک لی جاتی ہے۔
۳— وعدہ خلافی کرنے سے دشمن مسلط ہوجاتا ہے۔
۴— دوسروں کا ناجائز مال لینے سے قتل وقتال اور باہمی خونریزی واقع ہوتی ہے۔
۵— سود کے لین دین سے زلزلے آتے ہیں۔
۶— جب زنا کاری عام ہوجائے تو طاعون پھیل جاتا ہے۔(روح البیان ۷/۴۷)

ماہِ رواں

ماہ محرم اور شیعیت

مفتی شعیب احمد بستوی

معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور

اسلامی سال بارہ مہینوں پر مشتمل ہے اوران بارہ میں سے چار مہینے حرمت کے کہلاتے ہیں ان عدة الشهور عندالله اثناعشر شهراً فی کتاب الله...... منها اربعة حرم کے اندراسی کو بیان کیا گیا ہے ان میں سے پہلا مہینہ محرم الحرام کہلاتا ہے، محرم کے لغوی معنی ہیں قابل تعظیم وعظمت۔ گویا شرعاً ولغۃً یہ مہینہ قابل عظمت ہے۔اوراصولی طور پر یہ بات یادرہے کہ کسی مہینہ، دن یا کسی زمانہ میں حرمت وعظمت فضیلت وشرافت کااصل سبب اللہ تعالیٰ کی تجلیات وانوارات کااس زمانہ میں ظاہر ہونا ہے گوکسی عظیم الشان واقعہ کارونما ہونا بھی ثانی درجہ میں اس کی فضیلت وحرمت کا سبب بن جاتا ہے لیکن اصل سبب اللہ تعالیٰ کی تجلیات کاظاہر ہوناہی ہے۔اورکسی دن یامہینہ میں تجلیات ربانی کے ظہورکاعلم بجزوحی کے نہیں ہوسکتااوروحی صرف نبی برحق پرآتی ہےتو گویایوں کہہ سکتے ہیں کہ زمان ومکان کی فضیلت کاعلم بغیرنبی کےنہیں ہوسکتا۔

جب اس حیثیت سے ہم آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کودیکھتے ہیں تومعلوم ہوتا ہے کہ یہ مہینہ اپنی ابتداءآفرینش سے ہی عظمت کامہینہ ہے جیسا کہ آیت کریمہ منهااربعة حرم اس پر دلالت کرتی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل لوگ اس مہینہ کی عظمت کرتے تھے۔چنانچہ مشرکین عرب جواپنی خانہ جنگی میں ضرب المثل تھے جن کے یہاں ایک معمولی واقعہ بھی سالوں کی جنگ کاپیش خیمہ بن جاتا تھاوہ بھی ان حرمت والےمہینوں میں اپنی خانہ جنگیوں کوروک لیتے تھے اورخودشریعت محمدیہ کے اندر بھی ابتداء میں ان مہینوں کے اندرقتل وقتال ممنوع تھاچنانچہ يسئلونک عن الشهر الحرام قتال فيه قل قتال فيه كبير۔میں ممانعت قتال مذکور ہے۔اگرچہ جمہورامت کےنزدیک یہ حکم اب باقی نہیں رہالیکن اس سےاس مہینہ کی عظمت وحرمت پر کوئی اثرنہیں پڑتا کیوں کہ وہ پہلے ہی سےقابل تعظیم ہے۔

لیکن آج امت کاایک بڑاطبقہ اس سےغافل ہےان کےنزدیک اس مہینہ کی فضیلت ایک عظیم

واقعہ کی وجہ سے ہے اور وہ ہے شہادت سیدنا حسینؓ کا عظیم واقعہ۔

یقیناً شہادت حسین امت محمد یہ اور ملت اسلامیہ کے عظیم ترین حوادث میں سے ہے اور اس خونی واقعہ اور حضرت حسین کی مظلومانہ شہادت کے واقعہ کو پڑھ کر کلیجہ منھ کو آجاتا ہے اور کیوں نہ ہو آپ تو اہل بیت نبی اور نواسۂ رسول ہیں اور اہل بیت سے محبت تو ایمان کی علامت ہے جس کو بھی نبی اور اہل بیت سے محبت ہوگی اور جو مؤمن صادق ہوگا وہ یقیناً اس واقعہ پر رنجیدہ اور مغموم ہوگا۔

مگر شہادت حسین کو حرمت محرم کا اصل سبب قرار دینا، سیاسی مصلحت اور سوچی سمجھی اسکیم ہے یہ ساری کارستانیاں اس فرقہ کی ہیں جن کو عرف عام میں شیعہ کہا جاتا ہے اس فرقہ کے عقائد سے اکثریت ناواقف ہے چنانچہ وہ لوگ شہادت حسین کی آڑ میں جو کچھ اس مہینہ میں کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی تاریخ سے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ لیکن عدم واقفیت اور جہالت کے سبب اہل سنت والجماعت کے بہت سے لوگ بھی اسے حقیقت سمجھتے ہیں اور بہت سی غیر شرعی باتوں اور کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی جانکاری کے لیے آئندہ سطور میں شیعیت کی اصل اور اسکے کچھ معتقدات ذکر کئے جاتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شیعہ اسلامی فرقہ نہیں بلکہ سیاسی فرقہ ہے، یعنی اس فرقہ کا وجود سیاسی مقاصد کے لیے ہوا ہے نہ کہ دینی مقاصد کے لیے، گرچہ بعد میں اس پر مذہبیت غالب آگئی اور اب اس کی پہچان اسلامی فرقہ کے طور پر ہے۔ چنانچہ مؤرخین کی تشریح کے بموجب اس فرقہ کا بانی اول عبد اللہ بن سبا ہے جو یمن کے شہر صنعاء کا یہودی نژاد ایک سیاہ فام باندی کے بطن سے تھا، منافقانہ روش اختیار کرتے ہوئے اس نے حضرت عثمان غنی کے دور خلافت میں ظاہراً اسلام قبول کیا جب کہ باطن میں حضرت عثمان اور ان کے حکام کے شدید مخالفین میں تھا اس نے حضرت علی کے متعلق مسلمانوں میں اپنے شرارت آمیز اور گمراہ کن خیالات پھیلانا شروع کردئے۔ حضرت علیؓ کے وصی رسول ہونے کا عقیدہ سب سے پہلے اسی نے گھڑا چنانچہ وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے تورات میں دیکھا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علیؓ ہیں جس طرح حضور افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء تھے اسی طرح حضرت علیؓ خاتم الاوصیاء وافضل الاوصیاء ہیں۔ نیز خلافت کے اصل حقدار حضرت علیؓ ہیں حضرت عثمانؓ نے اسے غصب کر رکھا ہے اور پھر اس نے حکام وقت کے نقائص ومعائب بیان کرنا شروع کردیئے اور اپنے متبعین کو بھی اسی

راہ پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکام کے چھوٹے سے چھوٹے عیب کی خوب تشہیر ہوئی اور پھر اسی کو نقض بیعت کا حیلہ بنا کر امت کے شیرازہ کو منتشر کر دیا۔

عبداللہ بن سبا ہی نے الوہیت علیؓ کے عقیدے کی تشہیر کی جب حضرت علیؓ کو اپنے دور خلافت میں اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو قتل کرانا چاہا لیکن بعض صحابہ نے کہا کہ یہ مصلحت وقت کے خلاف ہے اس لیے اسے مدائن کی طرف ملک بدر کر دیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حب علیؓ سے فائدہ اٹھا کر اس نے حضرت علیؓ کی غیبت کو انتہائی المناک قرار دیا اور پھر ایک نیا عقیدہ یہ گھڑ لیا کہ حضرت علیؓ مقتول نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ تو ایک شیطان تھا جو آپ کی صورت میں متشکل تھا حضرت عیسیٰ کی طرح حضرت علی بھی آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے کفریہ عقائد کی تشہیر کی اسی فرقہ نے آگے چل کر شیعہ حضرات کے مختلف فرقوں کو جنم دیا۔ بہر حال قصر شیعیت کی خشت اول یہی ہے۔

اس وقت جو شیعہ حضرات مختلف بلاد اسلامیہ میں پائے جاتے ہیں وہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے عموم میں داخل ہیں ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کے نزدیک بالترتیب بارہ امام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

نام	کنیت	لقب	سن پیدائش	وفات
علی ابن ابی طالب	ابوالحسن	المرتضیٰ	۲۳ رسال قبل ہجرت	۴۰ھ
حسن ابن علی	ابومحمد	الزکی	۲ رسال بعد ہجرت	۵۰ھ
حسین ابن علی	ابوعبداللہ	الشہید	۳ رسال بعد ہجرت	۶۱ھ
علی بن حسین	ابومحمد	زین العابدین	۳۸ رسال بعد ہجرت	۹۵ھ
محمد بن علی	ابوجعفر	الباقر	۵۷ رسال بعد ہجرت	۱۱۴ھ
جعفر بن محمد	ابوعبداللہ	الصادق	۸۳ رسال بعد ہجرت	۱۴۸ھ
موسیٰ بن جعفر	ابوابراہیم	الکاظم	۱۲۸ رسال بعد ہجرت	۱۸۳ھ
علی بن موسیٰ	ابوالحسن	الرضا	۱۴۸ھ سال بعد ہجرت	۲۰۳
محمد بن علی	ابوجعفر	الجواد	۱۹۵ رسال بعد ہجرت	۲۲۰ھ
علی بن محمد	ابوالحسن	الہادی	۲۱۲ رسال بعد ہجرت	۲۵۴ھ
حسن بن علی	ابومحمد	العسکری	۲۳۲ رسال بعد ہجرت	۲۶۰ھ
محمد بن حسن	ابوالقاسم	المہدی	۲۵۵ رسال بعد ہجرت	اب تک زندہ ہیں

ان کے نزدیک امام کا درجہ نبی مرسل کے برابر ہے، امام نبی کی طرح معصوم ہوتا ہے اسے قانون سازی

کا پورا حق ہوتا ہے اس کی ہر بات شریعت کا درجہ رکھتی ہے وہ نصوص عامہ کو مخصوص اور مطلق کو مقید کرسکتا ہے ان سے معجزات کا ظہور بھی ہوتا ہے انہیں علم کلی بالفعل حاصل ہوتا ہے وغیر ذلک۔اور بارہویں امام کو شیعہ حضرات امام غائب کے نام سے جانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ابھی تک حیات ہیں اور قرب قیامت میں ظاہر ہوں گے، حدیث میں آتا ہے کہ قرب قیامت حضرت مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ان کے متعلق احادیث میں مذکور ہیں، شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ جس مہدیٔ موعود کی خبر حدیث میں دی گئی ہے وہی امام غائب ہیں۔جب کہ حدیث میں مذکور مہدی موعود باجماع امت ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہ چند چیزیں ذکر کی گئی ہیں بہر حال شہادت حسین کی آڑ میں شیعہ حضرات جو کچھ اس مہینہ میں کرتے ہیں مثلاً ماتم، نیزہ بازی، صحابۂ کرام پر تبرا، خصوصاً حضرات شیخین اور حضرت امیر معاویہ کو برا بھلا کہنا ان کی عیب جوئی کرنا، ازواج مطہرات پر لعن وطعن کرنا سب ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے۔

خوشی کے موقع پر خوش ہونا اور غم کے موقع پر غمگین ہونا تو انسانی فطرت ہے اس فطرت کو کون بدل سکتا ہے لیکن اگر اس طرح کے واقعات کو لے کر غم منانے لگیں، ماتم کرنے لگیں پھر تو اسلامی تاریخ کا ایک ایک دن ایسے واقعات سے لبریز ہے، امت کے لیے جو سب سے بڑا غم ہوسکتا ہے وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا سے پردہ فرما جانا ہے لیکن جب اس دن کو بھی شریعت نے یوم الحزن کے طور پر منانے کی اجازت نہیں دی اور نہ ہی آپ کے صحابہ نے منایا تو پھر کسی اور دن کو یوم الحزن کے طور پر منانا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے اور پھر شہادت تو قسمت والوں کو ملا کرتی ہے یہ تو وہ چیز ہے جو مانگنے سے نہیں بلکہ مقدر سے ملتی ہے۔

اس مہینہ میں جو چیز کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یوم عاشورہ کا روزہ رکھا جائے۔روایات میں آتا ہے کہ عاشورہ کا روزہ رمضان کے بعد تمام روزوں سے افضل ہے اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے امید ہے کہ عاشورہ کا روزہ سال گذشتہ کے تمام صغائر کا کفارہ ہوجاتا ہے۔فرضیت رمضان سے قبل یہ روزہ فرض تھا گو اس کی فرضیت اب ختم ہوگئی لیکن سنیت اب بھی باقی ہے لیکن یاد رہے کہ باطن ہمیشہ اپنے ظاہر سے متاثر ہوتا ہے اس لئے اسلام نے کفار کی ظاہری بود وباش اور طرز اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے چونکہ عاشورہ کا روزہ یہودی بھی رکھتے ہیں تو صرف ایک دن کا روزہ رکھنے میں ان کے ساتھ مشابہت تھی اس لیے شریعت میں حکم ہے کہ اس کے ساتھ ایک دن کا روزہ اور ملا لو بہتر تو یہ ہے کہ نو اور دس تاریخ کو روزہ رکھو اور اگر کسی وجہ سے نو کا روزہ نہ رکھ سکو تو دس اور گیارہ کا رکھ لو۔

علمی تحقیق

تیسری قسط

ضعیف احادیث کی تشریعی حیثیت

سوال اور اس کا جواب

المجیب: مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

۳— ”حدیثِ ضعیف شدید“ (جس میں متروک، یا متہم درجہ کا راوی ہو)۔

حدیثِ ضعیف کی یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں عام طور پر علمائے محققین نے احتیاط کا معاملہ فرمایا ہے، بلکہ بہت سے محدثین مطلقاً اس کی روایت کی ممانعت کے قائل ہیں، پھر جمہور جو کہ فی الجملہ اس کی روایت کے جواز کے قائل ہیں اُن کے ہاں بھی جواز کے لیے مختلف شرائط ہیں:

۱— وہ موضوع کی حد تک نہ پہنچتی ہو۔

(واضح رہے کہ یہ تعبیر حافظ ابن الصلاح (ت ۶۴۳ھ)، نووی (ت ۶۷۶ھ)، ابن دقیق العید (ت ۷۰۲ھ) اور ابن تیمیہ (ت ۷۲۸ھ) وغیرہم رحمہم اللہ کے اقوال کی روشنی میں اختیار کی گئی ہے، اِس لیے کہ ان حضرات کے ہاں ”ما لم یکن موضوعاً“ جیسے الفاظ آئے ہیں، اِس کے برخلاف حافظ العلائی (ت ۷۶۱ھ)، ابن حجر (ت ۸۵۲ھ) فی روایۃٍ، سخاوی (ت ۹۰۲ھ) اور سیوطی (ت ۹۱۱ھ) وغیرہم رحمہم اللہ کے یہاں ”شدید الضعف“ روایت کو بھی بطور حوالہ کے بیان کرنا جائز نہیں، مزید تفصیل اِن شاء اللہ آخری سوال کے جواب کے تحت آئے گی)۔

۲— بابِ عقائد اور اَحکام اور اثباتِ استحباب میں اس کو نہ بیان کیا جائے، البتہ بابِ فضائل (ترغیب وترہیب، وعدہ ووعید، قَصص واَمثال وغیرہ) میں بیان کرنے کی گنجائش ہے۔

۳— وہ شدید الضعف حدیث کسی حدیثِ قوی، یا اصلِ شرعی کے مخالف نہ ہو (یعنی منکَر نہ ہو)۔

۴— چوتھی اور اہم قابلِ لحاظ شرط یہ بھی ہے کہ کسی اصلِ شرعی سے اس کی فی الجملہ تائید ہوتی ہو (یعنی اپنے مضمون کے لحاظ سے شاذ اور منفرد نہ ہو)۔

اِن کے علاوہ یہ دو شرطیں بھی اہم ہیں:

۵ــعمل کرنے والا اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ کرے، بلکہ صرف بطورِ احتیاط کے عمل کرے کہ اگر اس کا ثبوت ہوا تو ثواب مل جائے گا، ورنہ عمل نہ کرنے پر کوئی گناہ بہر حال نہ ہوگا، محقق جلال الدین دوانیؒ اِس موضوع پر مناقشہ کرتے ہوئے اپنے طویل کلام کے آخر میں فرماتے ہیں... :

وحاصل الجواب: أن الجواز معلوم من خارج، والاستحباب معلوم أيضاً من القواعد الشرعية الدالة على استحباب الاحتياط في الدين، فلم يثبت بالحديث الضعيف شيء من الأحكام، بل أوقع الضعيفُ شبهة الاستحباب، فصار الاحتياط أن يُعمل به، واستحباب الاحتياط معلوم من القواعد الشرعية (الفتوحات الربانية على الأذكار النواوية ۱/ ۸۵، والأجوبة الفاضلة ۵۵-۵۷)۔

اِس میں محققِ دوانیؒ کا جملہ ''فلم يثبت بالحديث الضعيف شيء من الأحكام، بل أوقع الضعيفُ شبهةَ الاستحباب، فصار الاحتياط أن يُعمل به'' بطور خاص قابلِ توجہ ہے، کہ حدیث سنداً گو ضعیف ہی ہے، مگر اِس سے فی الجملہ اِحتمال تو پیدا ہی ہو گیا کہ شاید واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہو، اِس لیے اِحتیاط کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس پر عمل کرلیا جائے۔

حضرت الاستاذ الجونفوریؒ فرماتے ہیں:

> دوسرا اَمر یہ ہے کہ شیخ عز الدین بن عبد السلام، ابن دقیق العید، حافظ ابن حجر اور ان کے متبعین کا یہ فرمانا کہ عمل بالضعیف کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ کرے، بلکہ احتیاط کا قصد کرے۔علامہ شمس الدین الرملی وغیرہ نے اِس شرط کو محلِ اشکال قرار دیا ہے، اِشکال بظاہر یہ ہے کہ اگر ثبوت کا اعتقاد نہ ہو تو پھر عمل کیسا؟ کسی روایت کے مطابق عمل کرنا اُس کے ثابت ماننے کی فرع ہے!۔
>
> اِس کا جواب یہ ہے کہ عمل جیسے ثبوت پر متفرع ہوتا ہے ایسے ہی اِحتمالِ ثبوت پر (بھی) متفرع ہوسکتا ہے، اِحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ عمل کرلیا جائے، رہا عدمِ ثبوت کا احتمال تو وہ مضر نہیں ہے، اِس لیے کہ اگرچہ عدمِ ثبوت کی صورت میں یہ اِشکال پیش آتا ہے کہ جو چیز صاحبِ نبوت سے ثابت نہ ہو اُس پر عمل کرلینا شریعت میں اضافہ کی ایک شکل ہے، جو بدعت ہے، (مگر) یہ مضر اِس لیے نہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی یہ شرط لگادی ہے کہ وہ حدیثِ ضعیف کسی اصلِ عام کے تحت آتی ہو'' (الیواقیت الغالیة ۲/ ۳۰۳)۔

۶ــچھٹی شرط یہ ہے کہ اس سے ثابت عمل کو سنت نہ سمجھے۔ظاہر ہے کہ اصطلاحی طور پر ''سنت''

جس درجے کی چیز ہے اُس کا ثبوت ایسی شدید الضعف حدیث سے نہیں ہوسکتا، بلکہ "استحباب" بھی ثابت نہیں ہوسکتا، زیادہ سے زیادہ "إن الکَذوب قد یَصدُق" کے تحت صرف ثبوت کا ایک احتمال پیدا ہوسکتا ہے، بلکہ "سنیت" کا اعتقاد تو اس کو "بدعت" کی حدود میں پہنچادے گا، لہٰذا محض توقعِ ثواب وعقاب کی بنا پر شدید الضعف حدیث کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، بطور الزام واحتجاج کے نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

۷— اور اسی بنا پر یہ بھی شرط ہے کہ اس کی اشاعت اور تشہیر کے درپئے نہ ہو، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ولکن اشتهر أن أهل العلم يتسامحون في إيراد الأحاديث في الفضائل؛ وإن كان فيها ضعف، ما لم تكن موضوعةً، وينبغي مع ذلک اشتراطُ أن يَعتقد العامل كونَ ذلك الحديث ضعيفاً، وأن لا يشتهر (كذا، والظاهر أن صوابه :يُشَهِّر) ذلك، لئلا يعمل المرءُ بحديث ضعيف، فيشرع ما ليس بشرع، أو يراه بعض الجهال فيظن أنه سنة صحيحة... الخ

(تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب، ص ۳-۴)۔

(احقر عرض کرتا ہے کہ یہ بات حضرت تھانویؒ نے بھی اپنے "ملفوظات" میں کہیں فرمائی ہے، اور یہ بہت اہم ترین اور قابلِ لحاظ نکتہ ہے، کہ ایسی شدید الضعف احادیث کی عوام میں زیادہ اِشاعت کے درپئے نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ عوام مذکورہ بالا شرائط کا لحاظ نہیں رکھ پاتے، اور مباح یا مندوب کو سنت یا واجب تک سمجھنے لگتے ہیں، یا اس کے برعکس خلافِ اولیٰ کو مکروہ یا حرام سمجھنے لگتے ہیں، جو بلا شبہ بدعت کی ایک صورت ہے، البتہ کتابوں میں عمومی انداز میں ایسی احادیث کے اندراج میں کچھ حرج نہیں، جیسا کہ تعاملِ اکابر سے یہ بات ظاہر ہے)۔ واللہ اعلم

ان سات شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ:

۸— "اُس کے ضعف پر تنبیہ ضرور کی جائے"۔ اور اِسی پر بنا رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ حدیثِ ضعیف کو جزم کے صیغے کے ساتھ بیان نہ کرے، بلکہ تضعیف کے صیغے کے ساتھ بیان کیا جائے، جیسے "رُوِیَ" اور "نُقِلَ" وغیرہ۔

مگر ابن الصلاح کے ہاں صراحت پائی جاتی ہے کہ "موضوع" کے علاوہ تمام احادیث کو "ضعف" پر تنبیہ کے بغیر بھی بیان کرنا جائز ہے، تاہم احتیاط یقیناً اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بندہ کا اپنے اکابر اور سلفِ صالحین کے مجموعی طرزِ عمل کی روشنی میں مذاق یہ ہے کہ ''شدید الضعف'' روایت خود تو بیان کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ یہی محققین کی ایک جماعت کا مذہب ہے، البتہ جن بزرگوں نے ایسی روایات بیان فرمائی ہیں اُن پر کسی قسم کا اعتراض بھی روا نہیں، اِس لیے کہ اس کا تسلسل سلفِ صالحین سے چلا آرہا ہے۔ **واللہ ولي التوفیق والھدایۃ، والمنقذ من الضلال والغوایۃ۔**

۴— حدیثِ ضعیف کی چوتھی قسم ہے : ''حدیثِ موضوع''۔

جس کو تو صحیح معنوں میں ''حدیث'' کہنا ہی مناسب نہیں، اور ایسی خبر کا حدیث کے طور پر بیان کرنا، ناجائز اور حرام ہے، اِس میں بہت اِحتیاط کی ضرورت ہے۔

یہاں علامہ طحطاویؒ نے ایک اِضافہ فرمادیا ہے: **''أي حیث کان مخالفاً لقواعد الشریعة، أما لو کان داخلاً تحت أصل عام فلا مانع منه، لا لجعله حدیثاً، بل لدخوله تحت الأصل العام''** (یعنی: موضوع حدیث کو فضائل اعمال وغیرہ میں بیان کرنا اُس وقت ممنوع ہے جب کہ وہ قواعدِ شرعیہ کے خلاف ہو، لہٰذا اگر وہ کسی قاعدۂ کلیہ کے تحت آرہی ہو پھر یہ ممانعت نہیں ہے، اِس لیے کہ اس وقت اصل مدار تو اُس کلی پر ہوا، نہ کہ اِن الفاظ پر)۔ اِس کو نقل کرکے علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں : ''فتأمل''۔

حضرت الاستاذ الجونفوریؒ فرماتے ہیں :

> ''بندہ کے خیال میں علامہ طحطاویؒ کا کلام صحیح نہیں ہے، اِس لیے کہ جب ''موضوع'' روایت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی نہیں ہے تو اس پر عمل کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ اور اگر وہ اصلِ عام کے تحت داخل ہے تو عمل اُس عام پر ہوگا، نہ کہ اس باطل موضوع روایت پر، غالباً علامہ شامیؒ نے ''فتأمل'' سے اِسی طرف اشارہ کیا ہے'' (الیواقیت الغالیہ ۲/۳۰۵)۔

تاہم یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ کسی سند میں صرف کسی کذاب یا وضاع راوی کے آجانے ہی سے اُس کا ''موضوع'' ہونا لازم نہیں آجاتا، حافظ عراقیؒ فرماتے ہیں: **ومع ھذا فلا یلزم من وجود کذابٍ في السند :أن یکون الحدیث موضوعاً، إذ مطلق کذب الراوي لا یدلّ علی الوضع . . .** (شرح التبصرۃ والتذکرۃ للعراقی ۱/۳۰۷)۔

البتہ یہ اُس کے بطلان یا وضع پر من جملہ قرائن کے ایک قرینہ ضرور ہے، جس کے مؤثر ہونے نہ

ہونے کا فیصلہ، موقع محل کے لحاظ سے کوئی ماہرِ فن ہی کرسکتا ہے۔

اِس کے برعکس ہر معقول، یا ہر مطابقِ واقعہ بات کا قولِ رسول ہونا بھی ضروری نہیں، اِمام مزّیؒ فرماتے ہیں: ''کل ما قاله رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم حقّ، ولیس کل ما هو حق، قاله رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم'' (کما فی حاشیۃ ''ظفر الامانی'' ص ۲۵۶، از: شیخ ابوغدۃؒ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ساری باتیں برحق ہیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر حق بات آپ نے فرمائی بھی ہو۔

اِسی طرح قاضی ابن جماعہؒ فرماتے ہیں:

إن المعوَّل في ذلك هو النقل، ولیس کل ما یُجوِّزه العقل یستلزم الوقوع [الزیادات علی الموضوعات لسیوطی ۱/۳۲۸] (حدیث کے ثبوت کا مدار نقلِ صحیح پر ہے، لٰہذا یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز عقلاً جائز ہو وہ حدیثِ رسول بھی ہو)۔

شیخ عبد الفتاح ابوغدۃؒ نے حدیثِ موضوع سے خوش ہونے، اور اُس سے اِستناد کی کوشش کرنے کو ''بیمار ذہنیت'' کی علامت قرار دیا ہے (حاشیۃ ''ظفر الأمانی'' للکنوی ص ۲۸۰-۲۸۱)۔

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ بعض صوفیہ ومشائخ کے بعض معمولات ایسے ہوتے ہیں جن کی حدیث میں کوئی سند نہیں ہوتی، تو اگر وہ اُصولِ شریعت کے خلاف نہ ہوں، تو اُن کے اِختیار کرنے اور اُن کی تلقین کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ:

۱) اُن کو سنت کے طور پر نہ پیش کیا جائے۔

۲) اور اُن پر (از خود) کسی خاص ثواب، یا اجر کی تعیین نہ کی جائے۔

۳) اور اگر اُس باب میں کوئی ایسی خبر موجود ہو جس کے موضوع اور باطل ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے، تو اُس کی طرف استناد نہ کیا جائے۔

بہر حال! یہ موضوع بھی نہایت نازک اور افراط وتفریط کا خاص محل ہے، اگر ایک طرف عوام الناس، بلکہ بہت سے اہلِ علم بھی ''موضوع'' احادیث کے بیان میں بھی تساہل کا معاملہ کرتے ہیں، تو دوسری طرف بہت سے متشدد حضرات ''حدیثِ ضعیف'' کی ابتدائی تین قسموں کو بھی ''موضوع'' ہی کے حکم میں رکھ کر، مطلقاً رد کردیتے ہیں، وما أحسن من قال :الاعتدال حِلیة الرجال۔

خلاصۂ بحث:

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ جو"خبرِ واحد" مصحوب بالدلائل، یا محتف بالقرائن نہ ہوتو اس کی بنیاد پر کسی قول، فعل، یا حال وغیرہ کی جو نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جائے گی وہ (اصطلاحی لحاظ سے) بہرصورت "ظن" ہی کے درجے میں رہے گی، (اصطلاحی "یقین" تک نہیں پہنچے گی، ورنہ تو اس میں شک وشبہ کفر ٹھہرتا، حالاں کہ بعض کبارِ صحابہ اور سلفِ صالحین سے بھی ثقات سے مروی بعض اخبارِ آحاد پر کلام ثابت ہے، فقف و تأمل)۔

اس کے بعد خبر کی سند جس قدر قوی اور صحیح ہوگی اُسی کے بقدر "ظن" بھی غالب اور قوی ہوتا چلا جائے گا، اور جس قدر سند میں کمزوری اور خلل پیدا ہوتا جائے گا اسی کے بقدر "ظن" بھی مغلوب اور مضمحل ہوتا جائے گا، مگر جب تک دلائل یا قرائن سے، یا سند کی ظاہری حالت سے اُس خبر کے کذب، یا وضع، یا بطلان کا "یقین" نہ ہوجائے جب تک فی نفسہ اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ممنوع اور حرام نہ ہوگی (احتیاط کی بات الگ ہے)۔

اُمید کہ اِن تفصیلات سے آپ کے پہلے سؤال کا جواب واضح ہو گیا ہوگا۔ و باللہ التوفیق

حاصلِ مطالعہ ساتویں قسط

قرآن کریم میں مذکور تاریخی واقعات

مفتی عبداللہ سہارنپوری
متخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

قصہ حضرت نوح علیہ السلام

یہ بات گزشتہ مضمون سے واضح ہوچکی ہے کہ حضرت نُوح علیہ السلام نے انتہائی کوشش کی کہ قوم سمجھ جائے اور رحمتِ الٰہی کی آغوش میں آجائے، مگر قوم نے نہ مانا، مزید حضرت نوح سے کہنے لگی: ''نوح تو نے ہم سے جھگڑا کیا، اور بہت جھگڑا کیا، اب اس کو ختم کر، اور جو تو نے ہم سے عذاب الٰہی کا وعدہ کیا ہے وہ لے آ'' (ہود ۳۲)۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو جواب دیا کہ: ''عذابِ الٰہی میرے قبضے میں نہیں ہے، وہ تو اس کے قبضے میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ چاہے گا تو یہ سب کچھ بھی ہوجائے گا (ہود ۳۳)۔

بہر حال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام بالکل مایوس ہوگئے، قوم کا عناد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہوگئی، اور قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نوسو سال کے پیہم دعوت و تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا، تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے، تب خدا تعالی نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا: ''اور نوح پر وحی کی گئی جو ایمان لے آئے وہ لے آئے، اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں، پس ان کے حرکات پر غم نہ کر'' (ہود ۳۶)۔

جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہوگیا کہ ان کی تبلیغِ حق میں کوئی کوتاہی نہیں ہے، بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ ہے، تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہوکر اللہ تعالی کی بارگاہ میں یہ دعا فرمائی: ''اے پروردگار! تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ، اگر تو ان کو یوں ہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی'' (نوح ۲۶-۲۷)۔

کشتی بنانے کا حکم:

اللہ تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور اپنے قانون ’’پاداشِ عمل‘‘ کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور اس پر اپنے عتاب وعذاب کا اعلان کر دیا، اور حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں، تا کہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے وہ اور اہلِ ایمان اُس عذاب سے محفوظ رہیں، جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب حکمِ ربی سے کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسنا اور مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے: ’’خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیروکار اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے، کیسا احمقانہ خیال ہے؟‘‘ حضرت نوح علیہ السلام بھی ان کو انجامِ کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر ان کی جرأت دیکھ کر انہی کے طرز پر جواب دیتے، اور اپنے کام میں مشغول رہتے، کیونکہ اللہ تعالی نے پہلے ہی ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا، ’’اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کیے جا، اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو، یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں‘‘ (ہود ۳۷)۔

آخر کشتی بن کر تیار ہوگئی، اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا، اور اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ روٹی پکانے کا تنور جوش مارنے لگا، یعنی اس سے پانی ابلنے لگا، جو طوفان کا مقدمہ تھا۔ اللہ تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام کو عذاب آنے کی یہ نشانی بتادی تھی کہ جب اس تنور سے پانی پھوٹنے لگے تو تم اہلِ ایمان کو لے کر کشتی میں سوار ہو جانا، چنانچہ زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا، تب وحی الہی نے ان کو حکم سنایا کہ: کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا جوڑا (ایک نر اور ایک مادہ) بھی کشتی میں اپنے ساتھ لے لو، اور وہ مختصر جماعت بھی جو تم پر ایمان لا چکی ہے (جس کی تعداد چالیس یا اسّی نفر پر مشتمل تھی) کشتی میں سوار ہو جائے، وہ لوگ مع ضروری جانوروں کے اس کشتی میں سوار ہو گئے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ وہ بھی اس میں سوار ہو جائے اور کافروں کے ساتھ نہ ہو، بیٹے نے جواب دیا کہ: ’’میں جلد ہی کسی بلند پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا، جو مجھ کو پانی میں غرق ہونے سے بچالے گا‘‘۔

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: ''آج کے دن اللہ کے قہر سے کوئی چیز بچانے والی نہیں مگر جس پر اللہ رحم کرے وہی بچ سکتا ہے''، غرض یہ کہ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پانی کا زور اس کی طرف بھی بڑھ گیا اور دونوں باپ بیٹے کے درمیان موج حائل ہوگئی، اس طرح ان کی گفتگو ختم ہوئی، چنانچہ کافروں کے ساتھ بیٹا بھی غرق ہوگیا، اہل ایمان صحیح سلامت اور محفوظ رہے۔ (ہود ۴۲-۴۳)

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان جب والد بزرگوار کی نصیحت اور دعوت کے باوجود کشتی میں سوار نہ ہوا، تو اس کو موجِ طوفان میں مبتلا دیکھ کر شفقتِ پدری نے ایک دوسرا راستہ اختیار کرتے ہوئے، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کیا کہ: آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ: میرے گھر والوں کو طوفان سے بچائیں گے اور بلاشبہ آپ کا وعدہ حق وصحیح ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ میرا بیٹا جو میرے گھر والوں میں داخل ہے وہ طوفان کی نذر ہو رہا ہے اور آپ تو احکم الحاکمین ہیں ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، اب بھی اس کو طوفان سے بچا سکتے ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ بیٹا آپ کے اہل وعیال میں داخل نہیں رہا، کیوں کہ اس کا عمل اچھا نہیں بلکہ یہ خاتمے تک کافر رہنے والا ہے، اس لیے آپ کو اس حقیقتِ حال سے بے خبر رہ کر مجھ سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے، ہم تمھیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں میں داخل نہ ہوجاؤ (ہود ۴۵-۴۶)۔

جودی پہاڑ:

غرض جب حکمِ الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو کشتیٔ نوح ''جودی'' پہاڑ پر ٹھہر گئی (ہود ۴۴)

پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہوگیا، اور ساکنانِ کشتی نے دوسری بار امن وسلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی بنا پر حضرت نوح کا لقب ''ابوالبشر ثانی'' (انسانوں کے دوسرے باپ) مشہور ہوا۔ (جاری۔۔۔۔۔)

بہشت نشیں

بہت روئے گی میرے بعد تجھ کو شام تنہائی

تذکرہ حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقیؒ

مولانا محمد آصف اعظمی

استاذ جامعہ حسینیہ لال دروازہ جون پور

برصغیر میں چند ایسے خوش نصیب خاندان رہے ہیں جنکی مساعی جلیلہ سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں اوراہل علم وادب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان موضوعات پر تحریری مواد پیش بھی کیا ہے، انھیں بافیض، قابل فخر خانوادوں میں سے امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی کا خاندان ہے، جو اپنی علمی ودینی خدمات کی وجہ سے ''این خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے۔

اس خانوادہ کے موجودہ دور کے درفرید، تقریباً نصف صدی تک امام اہلسنت کی حقیقی جانشینی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دینے والے، آسمانِ خطابت کے نیر تاباں، علوم واتقان میں گہرائی وگیرائی رکھنے والے، مدح صحابہ وفضائل صحابہ پر نکتہ آفریں برملا اظہار خیال فرمانے والے، حق وصداقت کے امین، ملک کی تمام معتبر ملی ودینی تنظیموں میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے، حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ۷۷ رسال کی عمر میں چند دنوں کی بیماری کے بعد ۲۴ راپریل ۲۰۲۴ء بروز بدھ رب کریم کی آغوش رحمت میں چلے گئے۔

مولانا کو گئے ہوئے دو ماہ کے قریب ہو گیا لیکن اب بھی دل ان کی جدائی کا یقین مشکل سے کر رہا ہے، بیک وقت اتنی ذمہ داریوں کو انجام دینے والے تھے کہ بہت سی جگہوں میں خلا پیدا ہو گیا ہے اللہ ہی ناصر ہے۔

تعلیمی مراحل ایک نظر میں

چونکہ آپ نے ایک ایسے اہم علمی گھرانہ میں آنکھ کھولی تھی جہاں کا ہر فرد علوم ومعرفت حق وحقانیت

میں اعلیٰ مقام کا حامل تھا۔ دادا امام اہلسنت تھے جن کو اگر مجدد بھی کہہ یا جائے تو غلط نہ ہوگا، کہ آپ نے پوری حکمت سے رافضیت کے سینہ پر مدح صحابہ کا علم نصب کر دیا تھا، مولانا کے والد محترم حضرت مولانا عبد السلام صاحب فاروقی کو علوم ظاہری و باطنی میں اعلی درجہ کا کمال حاصل تھا، مزید گھر و خاندان کا ہر فرد علمی مسائل کے افہام و تفہیم، بیان و تشریح سے وابستہ تھا، اس لیے اس کے اثرات لابدی تھے۔

آپ نے دار المبلغین لکھنو، مظاہر علوم سہارن پور، دار العلوم دیوبند کے اساطین امت، کبار اہل علم سے خوب خوب استفادہ کیا، اس لیے علم تفسیر، علم حدیث، علم ادب، اور فقہی اصول پر آپ کی بہت گہری نظر تھی، علم مناظرہ تو آپ کو ورثہ میں ملا تھا، اہم علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے ہر جگہ اکابر کے منظور نظر رہے بطورِ خاص مظاہر علوم سہارن پور کے ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ایسی شفقت فرماتے تھے جو بہت کم خوش نصیبوں کو میسر ہوتی ہے حتی کہ حضرت ناظم صاحب نے اردو اور عربی کے بہت سے اشعار آپ کو مخاطب کر کے کہے۔

دار العلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد آباو اجداد کے قائم کردہ علمی و مذہبی مرکز دار المبلغین کی بیاری میں تن من دھن سے لگ کر اسے بام عروج تک پہنچانے میں ایسے کلیدی کردار ادا کیے جو تاریخ کے ابواب میں روشن و تابندہ نظر آئیں گے۔

فن خطابت کی کچھ جھلکیاں

حضرت مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی کا اسم گرامی فن خطابت کی امامت کا دوسرا نام تھا، آواز میں اعلی درجہ کی صفائی، انداز البیلا تھا، درمیان تقریر کبھی کبھی اتنے باوزن انداز میں الفاظ ادا فرماتے کہ مجمع پر سناٹا چھا جاتا۔

آپ نے فرق باطلہ پر جب بھی کلام کیا انتہائی علمی اور استدلالی خطاب کیا، خطاب کا عنوان چاہے کچھ بھی رہا ہو، ہر سننے والا دم بخود رہ جاتا۔

مولانا اپنے موقف سے کبھی انحراف نہ کرتے، دشمنان صحابہ سے کبھی کسی طرح کے مذہبی اتحاد کے لیے آمادہ نہ تھے اور ان کے ساتھ کسی بھی پروگرام میں شرکت کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔

ایک بار تحفظ حرمین شریفین کے عنوان سے کسی بڑی مسلم تنظیم نے شہر جونپور میں ایک بڑا اجلاس منعقد کیا اور اس میں سب کو دعوت دی گئی، حتی کی شیعہ مذہب کی قد آور شخصیت کو بھی مدعو کیا گیا جو مولانا

کے مزاج کے سخت خلاف تھا ،مولانا اسٹیج پر تشریف فرماہوئے اور خطاب کے لیے مدعو کیا گیا تو آپ نے ایک جملہ ایسا فرمایا جس نے دشمنان صحابہ کو جماعت مسلمین سے علاحدہ ہونے کی وضاحت کردی، آپ نے فرمایا ماشاء اللہ آج کا یہ اسٹیج بہت ہی ہمہ گیر اسٹیج ہے،جس پر ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں،شیعہ بھی ہیں،عطف مغایرت کو چاہتا ہے اسی اصول نے واضح کردیا کہ دشمنان صحابہ کا تعلق اسلام سے نہیں ہے

ایک بار امروہہ کے دشمنان صحابہ نے بہت غلیظ حرکت کی وہ یہ کہ بوریوں کی مدد سے دو پتلے بنا دیے گئے اور ایک کا نام ابوبکر اور دوسرے کا نام عمر رکھ دیا گیا اور دونوں کے ہاتھ میں سوسو روپے سل دیے گیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئ کہ یہ دونوں پیسہ کے لالچی تھے،نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ،اس حادثہ کے بعد امروہہ کے غیور اہلسنت والجماعت کے افراد نے اس کے جواب میں ایک اجلاس منعقد کیا اور مدعو خصوصی کی حیثیت سے جانشین امام اہلسنت مداح صحابہ حضرت مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی رحمۃ اللہ کو دعوت دی گئ ،اس وقت مولانا مرحوم کی عین جوانی کا وقت تھا، دلائل خوب خوب مستحضر تھے اس لیے آپ نے ایسا پر جوش مدلل مفصل خطاب کیا اور اس باطل مذہب کے ایسے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے تھے کہ آج تک وہ بیان تاریخی خطابات میں شمار کیا جاتا ہے (نیٹ پر موجود ہے)

تقریبا ۲۵ رسال قبل عبادت گاہوں کی تعمیر سے متعلق حکومت وقت نے ایک بل پاس کیا جس سے مدارس ومساجد کے لیے مشکلات کا سامنا تھا ،جمعیت علماء ہند کے فعال ولائق ترین صدر گرامی فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ نے پورے ملک میں اس بل کے خلاف احتجاجی اجلاس کیے،مختلف مقررین نے اپنے اپنے انداز میں سرد و گرم تقریریں کیں،لیکن مجھے حضرت مولانا فاروقی کے خطاب کے چند جملے ابتک کانوں میں سنائی دینے کی طرح محسوس ہو رہے ہیں اور وہ جملے یہ تھے، وہ سیاہ بل جس بل سے نکلا ہے اسی بل میں ڈال دیا جائے ،اگر مسجد و مدرسہ باقی نہیں رہیں گے تو پارلیامنٹ ولال قلعہ باقی نہیں رہے گا،(اس لیے کہ جب روئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والے نہیں رہیں گے تو قیامت آجائے گی اور اللہ کہنے والے یہ مسجد و مدرسہ سے وابستہ افراد ہی ہوتے ہیں)

ماضی قریب میں ایک ندوی صاحب کو صحابہ کرام سے کچھ کد ہو گیا ہے اور وہ اپنی لن ترانیوں میں حضرت سیّدنا امیر معاویہ وحضرت ابوہریرہ حتی کہ حضرت صدیق اکبر کی خلافت پر بھی نشتر چلا بیٹھے،

ایسے موقع پر حضرت فاروقی کب تک برداشت کرتے بالآخر تقریراً وتحریراً کھلے عام احقاق حق وابطال باطل کیا اوران کی ہفوات وبکواس کا کھلےلفظوں رد کیااور بہت سےاشکالات پر وافر مقدار میں مواد فراہم کردیا جواہل ذوق کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔

مولانا فاروقی کے اخلاق حسنہ

مولانا فاروقی صاحب سے میرا تعلقتقریبا۲۵رسال تک رہااور بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کاموقع ملا، بس یہ کہہ سکتاہوں کہ جتنےقریب سے دیکھا اتنی ہی عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا، بہت ہی مخلصانہ کردارسامنےآتاچلا گیا، اپنائیت کااحساس بڑھتا گیا، کبھی حوصلہ افزائی توکبھی سخت لہجے میں تنبیہ، دونوں صورت میں اخلاص کی صورت گری معلوم ہوتی تھی، میرے والد صاحب (حافظ مفید صاحب علیہ الرحمۃ) بیمارہوئے اورحضرت فاروقی علیہ الرحمۃ کوعلم ہوگیاتوگاہے گاہےخیریت معلوم کرتے رہتے اور ایک بارصرف عیادت کیلئےلکھنوسےگھر(منگرانواں اعظم گڈھ)تشریف لائے،اس کےعلاوہ جب بھی ڈاکٹر کودکھانے کیلئے لکھنؤ جانا ہوتااورحضرت فاروقی کواطلاع ہوجاتی تو ہاسپیٹل آکر ملاقات کرتے کبھی کسی جگہ قیام ہوتاتو وہیں تشریف لاتےاس طرح کی ذرہ نوازی بہت کم نظرآتی ہے یہ سب حضرت کےمخلصانہ کردار کاثمرہ تھا۔

کہاں ڈھونڈیں نگاہیں، دل کوگرمانے کہاں جائیں

حرف آخر

حضرت کے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ تین صاحب زادے مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاروقی مولانا عبدالباری صاحب فاروقی حافظ عبدالمالک صاحب فاروقی ایک صاحب زادی محترمہ اور برادرصغیرحافظ عبدالعظیم صاحب فاروقی ودیگراحفادوغیرہ ہیں تمام حضرات کی خدمات عالیہ میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہوئےقلبی سکون محسوس کرتاہوں۔

حاصلِ مطالعہ تیسری قسط

دفاعِ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی

مفتی محمد جابر میواتی
استاذ شعبۂ تفسیر مظاہر علوم سہارنپور

دوسرا اعتراض:

امام اعظم ابوحنیفہؒ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ فرقۂ باطلہ مرجئہ میں سے تھے۔

جواب: اِس اعتراض کے دفعیہ سے پہلے ضروری ہے کہ ''ارجاء'' کے معنی جان لیے جائیں۔

ارجاء کے لغوی معنی ہیں: مؤخر کرنا۔ اور اصطلاحاً یہ لفظ متعدد معانی ومفاہیم کے لیے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ:

۱۔ اُن لوگوں پر بھی ''ارجاء'' کا اطلاق کیا جاتا ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد صحابۂ کرام کی ہونے والی دونوں جماعتوں کے بارے میں حق و باطل ہونے کا کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس کو اللہ تعالی کے فیصلہ تک مؤخر کرتے تھے۔ اِس لحاظ سے ''ارجاء'' خوارج کے بالمقابل ہے۔

علامہ ظفر احمد تھانویؒ ''قواعد فی علوم الحدیث'' (ص ۲۳۳) میں لکھتے ہیں کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اِس معنی کر ''ارجاء'' گمراہی نہیں ہے، بلکہ مشاجراتِ صحابہ کے سلسلہ میں یہی موقف ورع اور احتیاط پر مبنی ہے۔

۲۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی بولا جاتا ہے جو حضرت علیؓ کو خلافت میں درجۂ اول سے درجۂ رابع تک مؤخر کرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے ''ارجاء'' شیعوں کے بالمقابل ہے۔

۳۔ اُن لوگوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے، کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور فرائض کو چھوڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اِس اعتبار سے ''ارجاء'' اہل سنت کے بالمقابل ہے۔

۴۔ اُن لوگوں پر بھی یہ بولا جاتا ہے جو خوارج کی طرح مرتکبِ کبیرہ کو کافر قرار نہیں دیتے، اور نہ ہی معتزلہ کی طرح اُس کو خارج از ایمان قرار دیتے ہیں، بلکہ ایمان کے اندر اعمال کی اہمیت کو تسلیم کرتے

ہوئے اُس کو مؤمن مانتے ہیں، اور اللہ تعالی سے مغفرت کی امید دلاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے ''ارجاء'' خوارج اور معتزلہ کے بالمقابل ہوگا جو محض ارتکابِ کبیرہ سے ایمان ختم ہونے کے قائل ہیں۔

اس لیے اگر کسی راوی کے بارے میں ''مرجئ'' کہا گیا ہوتو وہ مطلقاً جرح نہیں ہے، بلکہ پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ اُس پر یہ لفظ کس معنی کے لحاظ سے بولا گیا ہے۔

علامہ عبدالحی لکھنویؒ ''الرفع والتکمیل ''میں ارجاء سے متعلق طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والذي يجب علمُه على العالمِ المشتغلِ بكتب التواريخ وأسماءِ الرجال:أن الإرجاءَيُطلَق على قسمين:

أحدهما :الإرجاءالذي هو ضلالٌ، وهو الذي مرّ ذكرُه آنفاً.

وثانيهما :الإرجاءُ الذي ليس بضلالٍ، ولا يكون صاحبُه عن أهل السنة والجماعةِ خارجاً، ولهذا ذكروا أن المرجئةَ فرقتان :مرجئةُ الضلالة، ومرجئةُ أهل السنة، وأبو حنيفة وتلامذته وشيوخه وغيرُهم من الرواة الأثبات إنما عُدُّوا من مرجئة أهل السنة، لا من مرجئة الضلالة. اهـ.

کہ اجمالی طور پر ''ارجاء'' کی دو قسم ہیں، ایک قسم گمراہی ہے اور دوسری گمراہی نہیں، اور امام ابوحنیفہ اوران کے مشایخ وتلامذہ کو مرجئہ جو کہا جاتا ہے، وہ دوسری قسم کے لحاظ سے ہے، جو کہ اہل سنت میں سے ہی ہیں۔ اسی لیے حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

ولا عبرة بقول السليماني :كان من المرجئة :مِسعَر وحماد بن أبي سليمان، والنعمان، وعَمرو بن مرة، وعبد العزيز بن أبي رَوّاد، وأبو معاوية، وعمر بن ذَر، وسَرَدَ جماعةً. قلت - أي:الذهبي -:الإرجاءمذهبٌ لعدة من أجلة العلماء، ولا ينبغي التحامل على قائله.

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے معاصر عالم عثمان البتیؒ نے امام صاحب کو خط لکھا کہ آپ مرجئہ میں سے ہیں، اور اس سے متعلق اپنے شکوک وشبہات لکھے، امام صاحب نے اُس کا تفصیلی جواب مرحمت فرمایا، جس میں لکھتے ہیں کہ: مرجئہ دو قسم کے ہیں:(۱) مرجئہ ملعونہ، میں اُن سے بری ہوں، اور مرجئہ مرحومہ، میں اُن میں سے ہی ہوں، بلکہ انبیاء بھی انہی میں سے ہیں، کیا حضرت عیسی علیہ السلام کا قول قرآنِ پاک میں موجود نہیں

ہے! {إنْ تُعَذِّبْهُمْ فإنّهم عِبادُك، وإنْ تَغْفِرْ لَهُم فإنَّك أنتَ العَزِيزُ الحكيمُ}.

حافظ جمال الدین مِزّیؒ نے ''تہذیب الکمال'' میں امام ابوحنیفہ کے شاگرد مشہور محدث ابراہیم بن طہمان خراسانیؒ (جوصحاح ستہ کے راوی ہیں، اُن) کے بارے میں نقل کیا ہے:

وقال أبو الصلت عبد السلام بن صالح الهروي :سمعت سفيان بن عيينة يقول:ما قدم علينا خراساني أفضل من أبي رجاء عبد الله بن واقد الهروي. قلت له:فإبراهيم بن طهمان؟قال :كان ذاك مرجئاً.

قال أبو الصلت :لم يكن إرجاؤهم هذا المذهب الخبيث :أنّ الإيمان قول بلا عمل. وأن ترك العمل لا يضر بالإيمان، بل كان إرجاؤهم أنهم يرجون لأهل الكبائر الغفران، رداً على الخوارج وغيرهم الذين يُكفِّرون الناسَ بالذنوب. وكانوا يرجئون ولا يُكفِّرون بالذنوب، ونحن كذلك.

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوالصلت کہتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ خراسان سے ہمارے پاس ابورجاء عبداللہ بن واقد ہروی سے بڑی کوئی شخصیت نہیں آئی، میں نے عرض کیا کہ اور ابراہیم بن طہمان؟ توحضرت سفیانؒ نے فرمایا کہ وہ مرجئہ میں سے ہیں۔اس پر ابوالصلت فرماتے ہیں کہ اُن کا ارجاء یہ مردود مذہب نہیں تھا کہ ''ایمان محض زبانی اقرار کو قرار دیتے ہوں، اور اعمال کو ضروری قرار نہ دیتے ہوں''، بلکہ اُن کے ارجاء کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی کریم ذات سے گناہِ کبیرہ کے مرتکب کے لیے مغفرت کی امید رکھتے ہیں، اور خوارج ومعتزلہ وغیرہ پر رد کرتے ہیں جو محض گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی بناء پر ایک کلمہ گو شخص کو کافر قرار دے دیتے ہیں۔اور یہی ہم سب کا مذہب ہے۔

اور اگر کسی نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف مرجئۃ الضلالۃ والی بات منسوب کی ہے تو یہ نسبت درست نہیں ہے،علامہ شہرستانیؒ نے ''الملل والنحل'' (۱/۱۲۶) میں اس کی تین وجوہ بیان کی ہیں:

پہلی وجہ: یا تو اُس نے امام صاحب پر تہمت لگائی ہے اور اُن کی طرف غلط بات منسوب کی ہے، جیسا کہ فرقۂ غسانیہ کے بانی غسان نے کیا ہے۔مشہور شافعی محقق عالم ابن حجر ہیتمیؒ ''الخیرات الحسان'' میں لکھتے ہیں کہ شارحِ ''مواقف'' فرماتے ہیں کہ غسان کا مقصد اِس سے اپنے باطل مذہب کی ترویج واشاعت

تھی کہ اتنے بڑے امام کی طرف اپنا مذہب منسوب کر کے خود اُس کا مذہب مقبول ہو جائے گا۔

دوسری وجہ: امام صاحب کے زمانہ میں فرقِ باطلہ میں سے قدریہ اور معتزلہ کا زور تھا، اُن پر امام صاحب وغیرہ نے رد و قدح کی، اور معتزلہ کی عادت یہ تھی کہ جو بھی اُن کی مخالفت کرتا اُسی کو ''مرجئہ'' قرار دیدیتے تھے۔ شاید یہیں سے امام ابوحنیفہ وغیرہ کے نام کے ساتھ یہ لقب لگ گیا ہے، اور بعد والوں نے بھی اس کو بے محل استعمال کرلیا۔

تیسری وجہ: بعض لوگوں کو امام صاحب کی عبارت سمجھنے میں دھوکہ لگا ہے، امام صاحبؒ نے جب یہ فرمایا کہ : ''**الإیمان لا یزید و لا ینقص**'' تو وہ اِس عبارت سے یہ سمجھے کہ امام صاحب اعمال کا انکار کرتے ہیں، اُن کے نزدیک ایمان محض اعتقادِ قلبی کا نام ہے، اِس لیے اُن کی طرف ''ارجاء'' کی نسبت کردی۔ یہ اُن کی کوتاہ فہمی تھی، ایک متبحر عالم اعمال چھوڑنے کا فتوی کیسے دے سکتا ہے!!! یہی بات ابن حجر ہیتمیؒ نے محقق آمدی شافعیؒ سے بھی نقل کی ہے۔

اسی بات کو محقق کوثریؒ نے تفصیل سے ''تأنیب الخطیب'' (ص ۴۴) میں لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحبؒ کے زمانہ میں طبقۂ محدثین میں سے بہت سے حضرات کا اعتقاد یہ تھا کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے، اُس میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے، اور جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایمان تو اصلاً دل سے اعتقاد اور زبان سے اقرار کو کہتے ہیں، اور اعمال اُس ایمان کو کامل اور قوی کرتے ہیں، اُن کو یہ محدثین کرام ''مرجئہ'' کہہ دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن کریم کی یہ آیتِ شریفہ: {**و لَمَّا یَدْخُلِ الإیمانُ في قلوبِکم**} اور ''صحیح مسلم'' کی یہ حدیث : ''**الإیمان :أن تؤمن بالله، و ملائکته، و کتبه، و رسله، و الیوم الآخر. و تؤمن بالقدر خیره و شره**'' امام ابوحنیفہ وغیرہ کے مسلک کی واضح دلیلیں ہیں۔

اِس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ وغیرہ پر ''ارجاء'' کا اطلاق یا تو ''ارجاء سنی'' کے لحاظ سے ہے، جو معتزلہ وخوارج کے بالمقابل عین اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے، یا پھر جس نے ''ارجاء بدعی'' کو آپ کی طرف منسوب کیا ہے تو اُس کی بنیاد غلط فہمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسلامی تعلیمات

اچھے اور بُرے ناموں کے اثرات

مولانا انور شاہ

ماخوذ از ماہنامہ ''الفاروق''

نام انسان کے تعارف کا ذریعہ ہے، اسی کے ذریعے وہ مخاطب کیا جاتا ہے، اسی سے انسان کی معاشرہ میں شناخت ہوتی ہے، بغیر نام کے اس کی شناخت اور پہچان دشوار ہے، اس لیے ہر زمانے میں اور ہر قوم میں نام کا رواج رہا ہے، نام بچے کے لیے زیب وزینت کا سامان ہے، اچھے، بامعنی اور دل کش نام سے دل میں اس کی عظمت قائم ہوتی ہے، جب کہ برے نام طبیعت پر گراں گزرتے ہیں، جس کا اثر بعض اوقات اس نام والے کو بھدّا بنا دیتا ہے، نام باپ اور سرپرست کی طرف سے وہ قیمتی تحفہ ہے جو انسان کے ساتھ دنیا وآخرت میں ہمیشہ لگا رہتا ہے، کہیں جدا نہیں ہوتا، جس طرح آدمی نام سے دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے، ویسے ہی آخرت میں بھی اس کی شناخت اسی سے ہوگی، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے مسلمانوں کو اپنے بچوں کے لیے اچھا، دل کش اور بامعنی نام رکھنے کا حکم دیا اور اس کو والدین پر اولاد کا حق قرار دیا ہے اور جن ناموں کے معانی اچھے نہیں ان کو رکھنے سے منع کیا ہے۔

عمدہ نام اولاد کا والدین پر اہم حق ہے

بہرحال بچوں کے والدین پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ایک اہم ترین حق یہ ہے کہ بچہ کا اچھا نام رکھا جائے۔

آیئے! بچوں کے اچھے، بامعنی اور دل کش نام تجویز کرنے، مہمل، بے معنی اور برے ناموں سے احتراز کرنے کے سلسلے میں چند احادیث طیبہ بھی ملاحظ فرمائیں:

حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ باپ پر بچے کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کا اچھا اور عمدہ نام رکھے اور اس کو حسنِ ادب سے آراستہ کرے۔

ایک حدیث میں جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا نام باپ کی جانب سے پہلا اور بہترین تحفہ (گفٹ) قرار دیتے ہوئے فرمایا:

اوّل ماینحل الرجل ولده اسمه فلیحسن اسمه آدمی اپنے بچے کوسب پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے، اس لیے بچے کا اچھا نام رکھنا چاہیے۔

قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپ، دادا کے ناموں سے پکارے جاؤ گے، لہٰذا اچھے نام رکھا کرو۔

عن أبي الدرداء ، قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم، فأحسنوا أسماء كم (ابوداود ۴/ ۲۸۷،باب فی تغییر الاسماء)

وفي تحفة المودود:الفصل الثاني فيما يستحب من الأسماء ومايكره منها

وعن ابن عمر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:إن أحب أسمائكم إلى الله عز وجل عبد الله وعبد الرحمن

مذکورہ بالا احادیث طیبہ سے معلوم ہوا کہ:

باپ پر بچے کا ایک بنیادی اور اہم حق یہ بھی ہے کہ اس کے لیے اچھے سے اچھا نام تجویز کرے؛ لہٰذا باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس حق میں کوتاہی اور غفلت سے کام نہ لے۔

قیامت کے دن اپنے اور باپ کے نام سے پکارا جائے گا کہ فلاں آدمی جو فلاں کا بیٹا ہے، اب ظاہر ہے کہ میدانِ حشر میں اگر کوئی برے نام سے پکارا گیا تو اس بھرے مجمع میں بڑی خفت اور سبکی ہوگی، اس لیے وہ دن آنے سے پہلے توجہ دی جائے اور خود یا کسی اللہ والے عالم سے اچھا نام منتخب کرلیا جائے۔

یادرکھیے! نام رکھنے کا مقصد محض تعارف اور پہچان نہیں، بلکہ درحقیقت مذہب کی شناخت اس سے وابستہ ہے، فکر وعقیدہ کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے؛ اس لیے اس سلسلے میں احادیث طیبہ میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں، اچھے، دل کش اور بامعنی ناموں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور ایسے ناموں سے منع کیا گیا ہے جو برے معانی کے حامل ہوں۔

ناموں کے متعلق پیغمبر اسلام کی اصلاحات

عرب معاشرہ شرک و بت پرستی اور نخوت وتکبر جیسے عیوب سے آلودہ تھا، ان عیوب کا اثر ان کے

ناموں پر بھی پڑ گیا تھا، چناں چہ وہ اپنے لیے یا تو ایسے نام رکھنا پسند کرتے تھے، جن میں شرک و بت پرستی کا معنی موجود ہوتا یا ایسے نام اختیار کرتے تھے جن میں جراءت، بہادری، تکبر و غرور اور بڑائی کا معنی موجود ہوتا۔

تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ابوالرقیش اعرابی سے کسی نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم لوگ اپنی اولاد کے لیے کلب (کتا)، ذئب (بھیڑیا) جیسے برے نام تجویز کرتے ہو، جب کہ اپنے غلاموں کے لیے مرزوق (رزق دیا ہوا)، رباح (نفع پانے والا) جیسے عمدہ اور اچھے نام رکھتے ہو؟ ابوالرقیش اعرابی نے جواب میں کہا: بیٹوں کے نام دشمنوں کے لیے اور غلاموں کے نام اپنے لیے رکھتے ہیں، یعنی غلام تو اپنی خدمت اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے رکھے جاتے ہیں؛ اس لیے ان کے یہ نام رکھے گئے، اور اولاد چوں کہ دشمنوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر جنگ کرتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ نام تجویز کئے گئے، تا کہ ان کے نام سنتے ہی دشمن مرعوب ہو جائے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۱/۲)

بہر حال عرب معاشرہ میں شرکیہ نام اور دیگر برے معانی پر مشتمل نام رائج ہو چکے تھے، چناں چہ عبدالعزیٰ (عزیٰ بت کا بندہ)، عبدالکعبہ (کعبہ کا بندہ)، عبدالشمس (سورج کا بندہ)، غراب (کوا)، عاص (گنہگار) جیسے برے نام ان میں عام ہو چکے تھے۔ اپنی بہادری اور بڑائی جتانے کے لیے بعض اوقات وہ جنگلی درندوں کے نام بھی رکھ دیتے تھے، مثلاً: لیث (شیر)، اسد (شیر)، ذئب (بھیڑیا) وغیرہ۔

اسلام جو توحید اور امن و سلامتی کا دین ہے، تکبر و نخوت جیسے برے اوصاف سے بے زار ہے، اس لیے اس سلسلے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی اسلام قبول کرتا اور اس کا نام قابلِ اصلاح ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت اہتمام سے اس کے نام کی اصلاح فرماتے تھے۔

چناں چہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: **أن النبی صلی اللہ علیہ و سلم کان یغیر الاسم القبیح** یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم برے ناموں کو اچھے ناموں سے بدلتے تھے، چناں چہ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا، اس وفد میں ایک صاحب کا نام اصرم تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آدمی سے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا اصرم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم زرعہ ہو۔ (ابو داود ۷/۳۰۸ باب فی تغییر الاسم القبیح)

اصرم کا معنی ہے: کاٹنے والا، قطع کلام و قطع تعلق کرنے والا، جو کہ ایک منفی اور غلط معنی ہے، زرعہ کا

معنی کھیتی یا بیج کے ہے، یعنی دوسرے کو نفع پہچانے والا، جو ایک اچھا اور مثبت معنی ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکی کا نام جمیلہ رکھ دیا۔ جس کا پہلا نام عاصیہ (گناہ گار) تھا۔ غزوہ حنین کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا: آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: غراب۔ (غراب کوے کو کہتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج سے تم غراب نہیں، بلکہ مسلم ہو۔ (الادب المفرد ۱/ ۸۲۴)

شخصیت پر اچھے اور برے نام کے اثرات

مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقات شرح مشکوۃ میں لکھتے ہیں: اپنی اولاد اور خادم وغیرہ کے لیے اچھے نام کا انتخاب کرنا سنت ہے، کیوں کہ بسا اوقات برا نام تقدیر کے موافق ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا نام خسار (جس کے معنی گھاٹے اور نقصان کے ہے) رکھے تو ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر خود وہ شخص یا اس کا بیٹا تقدیرِ الٰہی کے تحت خسارہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کے نتیجے میں لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس کا خسارہ اور نقصان میں مبتلا ہونا نام کی وجہ سے ہے اور بات یہاں تک پہنچ جائے کہ لوگ اس کو منحوس جاننے لگیں اور اس کی ہم نشینی سے احتراز کرنے لگ جائیں۔ (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، باب الفال والطیرۃ، وکذا فی مظاہر حق ۵/ ۳۰۰)

حضرت فاروق اعظم کے متعلق منقول ہے کہ وہ صحابہ کرام کو باقاعدہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کے پاس ایسے آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجا کرو، جو خوب صورت اور اچھے نام والے ہوں۔

علماء لکھتے ہیں: اس کا سبب نفسیاتی تھا، اچھے نام اور اچھی صورت کا مخاطب پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

(احیاء علوم الدین ۴/ ۱۰۶، بیان حقیقۃ النعمۃ)

لہٰذا جس طرح والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت وحفاظت کریں، ان کی نشو ونما اور بہترین تعلیم وتربیت کی فکر کریں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ والدین بچوں کے لیے اچھے نام تجویز کریں۔

غرض انسان کی شخصیت پر نام کا اثر پڑتا ہے، اچھے ناموں کے اچھے اور برے ناموں کے برے اثرات ہوتے ہیں۔ چناں چہ ایک روایت میں یہ واقعہ منقول ہے کہ حضرت عبد الحمید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت سعید بن المسیب کی خدمت میں حاضر تھا، انہوں نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ میرے دادا جن کا

نام حزن تھا۔ وہ ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا میرا نام حزن (جس کا مطلب ہے سخت اور دشوار گزار زمین) ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حزن کوئی اچھا نام نہیں ہے، لہٰذا میں تمہارا نام تبدیل کر کے حزن کے بجائے سہل رکھ لیتا ہوں۔ (سہل کا معنی ہے کہ نرم اور ہموار زمین، جہاں انسان کو آرام ملے) اس پر میرے دادا نے کہا کہ میرے باپ نے میرے لیے جو نام رکھا ہے۔ میں اس کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ حضرت سعید ابن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد سے ہمارے خاندان میں ہمیشہ سختی رہی۔

ایک عجیب واقعہ

حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں ایک انجان شخص حاضر ہوا، سلام ودعا اور خیر وخبر کے بعد حضرت فاروق اعظم نے اس شخص سے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا جمرہ (انگارہ)، دریافت کیا کس کے بیٹے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ شہاب (آگ کا شعلہ)، پوچھا کہ کس قبیلہ سے تعلق ہے؟ اس شخص نے کہا حرقہ (سوختہ شدہ، جلی ہوئی بستی) سے، آپ نے سوال کیا، آپ کی رہائش کہاں ہے؟ جواب دیا حرۃ النار (آگ کی سرزمین)، آپ نے پھر سوال کیا، کونسی جگہ میں؟ اس آدمی نے کہا: ذات لظی (آگ کے شعلوں سے بھڑکنے والا ٹیلہ) میں، یہ سن کر فاروق اعظم نے فرمایا: جلدی اپنے گھر والوں کی خبر لو! وہ سب آگ میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے ہیں۔ جب اس نے جا کر دیکھا تو ویسے ہی پایا، جیسا کہ فاروق اعظم نے فرمایا تھا۔

(الموطا للامام مالک ۲/ ۹۷۳)

علامہ ابن القیم جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تحفۃ المودود باحکام المولود اور حافظ علامہ ابن حجر العسقلانی نے الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں اس قسم کے کئی واقعات ذکر کئے ہیں۔ باذوق حضرات وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

جدت پسندی کا بھوت

آج کل لوگوں کا یہ مزاج بنتا جا رہا ہے کہ بچوں کے ناموں میں جدت ہو، ایسا نام رکھا جائے جو پڑوس، محلہ اور آس پاس کی آبادی اور اہل قرابت میں سے کسی کا نہ ہو، خواہ اس کا معنی اور مفہوم کچھ بھی نکلتا ہو، چناں چہ بعض اوقات جدت پسندی کے جنون میں لوگ ایسے نئے نئے نام تجویز کرتے ہیں جو بے معنی اور مہمل قسم کے ہوتے ہیں یا غلط معانی کے حامل ہوتے ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ معارف القرآن میں رقم طراز ہیں:

کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیا ہے، ان کی صورت وسیرت سے پہلے بھی ان کا مسلمان سمجھنا مشکل تھا، ان کے نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے انگریزی طرز کے نام رکھے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خواتین اسلام کے طرز کے خلاف، خدیجہ، عائشہ اور فاطمہ کے بجائے نسیم، شمیم، شہناز، نجمہ پروین ہونے لگے۔ (معارف القرآن ۴/ ۱۳۲)

حضرت مولانا مفتی مہربان علی بڑوتی صاحبؒ نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ شہر مظفر نگر کے دیہات میں ایک عورت نے جوذرا قرآن کریم پڑھنا جانتی تھی، اس کے یہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، اس نے اپنے کوخواندہ سمجھتے ہوئے، بچیوں کے نام تجویز کرنے کے لیے قرآن کریم سے سورہ کوثر کا انتخاب کیا، چناں چہ بڑی بچی کا نام کوثر رکھا، دوسری کا نام وانحر تجویز کیا، اور تیسری کا نام ابتر مقرر کیا۔ کوثر اور وانحر کے معنی تو بحیثیتِ نام کسی حد تک درست بھی ہیں، لیکن آخری لفظ ابتر کا معنی تو بالکل غلط ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ (مسلمانوں کے نام اوران کے احکام ا/ ۱۳)

ایسے لوگوں کو بطور اصلاح کچھ کہا جائے تو سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم سے رکھے ہوئے ناموں کو تبدیل کرنا کون سے مسئلے کی بات ہے، حالاں کہ قرآن کریم سے نام تجویز کرنے کی بات علی الاطلاق درست نہیں ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں حمار، کلب، خنزیر، بقرہ، فرعون، ہامان، قارون وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہیں، تو ان کے طریقِ استدلال کے مطابق ان الفاظ کے ذریعے بھی نام رکھنا صحیح ہونا چاہیے۔

نام کے اچھا یا برا ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ نام پسند آجائے یا وہ قرآن کریم میں مذکور ہو، بلکہ اچھا ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں بھی وہ نام اچھا ہو، اسی طرح بعض لوگ اسلامی ہدایات کے برخلاف ناول، افسانوں، فلموں، ڈراموں اور دیگر غیر شرعی پروگراموں سے نام اخذ کرتے ہیں جو اکثر سراسر غیر اسلامی، بلکہ بسا اوقات اس میں مذاہبِ باطلہ کی آمیزش تک ہوتی ہے۔

یادرکھیے! نام کی حیثیت ایک قالب کی سی ہے، جس میں انسان ڈھلتا ہے، نام کا انسان کی فطرت پر نفسیاتی اثر رہتا ہے، اچھے نام والا آدمی اپنے نام کا اچھا اثر محسوس کرتا ہے، چناں چہ جب اس سے پکارا جاتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک عجیب طرح کی کیفیت محسوس کرتا ہے، اس کے برخلاف جس کا نام اچھا نہیں ہوتا وہ اپنے نفس کو جھنجوڑتا رہتا ہے۔

واقعات الفتاویٰ

فتاوی مظاہر علوم

مفتی بشیر احمد سہارنپوری
نائب مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سہارنپور

ماہ محرم اور سالِ نو کی مبارکباد

ماہ محرم الحرام سے نئے اسلامی سال کی ابتداء ہوتی ہے، ادھر کچھ سالوں سے اس موقعہ پر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کا رواج بڑھ گیا ہے، بالخصوص شوشل میڈیا پر سال نو کی مبارکبادی کے پیغامات کا کثرت کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے، اسلامی سالِ نو کی مبارکبادی کا یہ رواج و معمول حضرات صحابہ، تابعین عظام اور سلف صالحین کے دور میں نہیں تھا، اور اب جس طرح اس کا رواج و اہتمام ہونے لگا ہے خطرہ ہے کہ یہ بدعت کی شکل نہ اختیار کرلے اس لئے اس سے اجتناب و پرہیز ضروری ہے: **عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد۔** (مشکوٰۃ ص ۲۷)

ماہ محرم اور ماتم

ماہ محرم الحرام میں شیعہ فرقہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا ماتم کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے ان کا سوگ مناتا ہے، ان کے نام پر جلسے وجلوس اور مجالس عزاء منعقد کرتا ہے۔ یہ سب رسومات و بدعات ہیں، جن کا دین اسلام اور شریعت مصطفویہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے ان امور کا ارتکاب جائز نہیں ہے، اور ایسی مجالس میں شرکت کرنا اور اس طرح کے جلسے جلوس کا دیکھنا بھی جائز نہیں ہے۔ حضرات اکابر نے ماہ محرم میں حضرت حسینؓ کے قصۂ شہادت کے بیان اور سیاہ لباس کے پہننے سے بھی منع فرمایا ہے، تا کہ ماتم اور سوگ کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ (امداد الفتاویٰ ۵ / ۲۶۲، فتاوی محمودیہ ۳ / ۲۶۶)

ماہ محرم میں شادی سے احتراز

ماہ محرم میں بہت سے لوگ شادی سے گریز کرتے ہیں، جس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اس ماہ کو ماتم وسوگ کا مہینہ خیال کرتے ہیں چونکہ ماہ محرم میں ماتم اور سوگ کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس

لئے اس بنیاد پر اس ماہ میں نکاح وشادی سے احتراز وگریز شرعاً درست نہیں ہے۔

یوم عاشورہ کا روزہ

یوم عاشورہ یعنی دس محرم الحرام کا روزہ شروع اسلام میں فرض تھا، پھر جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہوگئی، مگر اس کے بعد بھی آپ علیہ السلام نے اس دن روزہ رکھنے کا معمول برقرار رکھا، لہٰذا یہ روزہ رکھنا بھی مسنون ومستحب ہے اور تنہا عاشورہ کا روزہ رکھ لینے سے یہ سنت و استحباب ادا ہوجائے گا۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری سال میں اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ آئندہ سال دسویں تاریخ کے ساتھ ایک روزہ اور شامل کروں گا، تاکہ یہود کی مخالفت ہوجائے، جو صرف عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر نے وفاء نہیں کی اور آئندہ سال عاشورہ آنے سے قبل ہی آپ کی وفات ہوگئی۔ اس لئے آپ کی اس خواہش وتمنا کے مطابق افضل واولیٰ یہ ہے کہ عاشورہ کے ساتھ ایک روزہ اور شامل کرلیا جائے تاکہ آپ کے معمول کی اتباع کے ساتھ آپ کی منشاء کی بھی تکمیل ہوجائے، اور سب سے افضل یہ ہے کہ ۹—۱۰—۱۱ تینوں تاریخوں کا روزہ رکھا جائے۔ **وحاصل الشريعة أن الأفضل صوم عاشوراء وصوم يوم قبله وبعده ثم الأدون منه صوم عاشوراء مع صوم يوم قبله أو بعده، ثم الأدون صوم عاشوراء فقط والثلاثة عبادات عظمى، وأما مافي الدر المختار من كراهة صوم عاشوراء منفرداً تنزيهاً فلا بد من التأويل فيه اى أنها عبادة مفضّلة من القسمين الباقيين و لا يحكم بكراهة فإنه عليه الصلوٰة والسلام صام مدة عمره صوم عاشوراء منفرداً و تمنىٰ إن لو بقي إلى المستقبل صام يوماً معه** (العرف الشذی علی سنن الترمذی للعلامہ انورشاہ کشمیری ۲/۱۷۷)

یوم عاشورہ کو اہلِ خانہ پر وسعت وفراخی

اہل خانہ پر کھانے پینے میں وسعت وفراخی کی فضیلت احادیث سے ثابت ہے کہ ''اس دن اہل خانہ پر وسعت کرنے سے اللہ تعالیٰ سال بھر وسعت وفراخی فرماتا ہے'' علامہ قرافی مالکیؒ نے ایک مستقل رسالہ میں ان کو جمع کیا ہے، اکابر واسلاف بھی اس کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، لہٰذا ہر شخص کیلئے اپنی استطاعت وذوق کے لحاظ سے یوم عاشورہ میں گھر والوں کے لئے کھانے پینے میں کشادگی کرنا اس دن کے روزہ کی طرح مسنون ومستحب ہے البتہ یہ ایک انفرادی عمل ہے، اس موقع پر اجتماعی دعوت وتقریب کا اہتمام حدّ اعتدال سے تجاوز کہلائے گا۔ (الدرالمختار ۲/۴۱۸)

تبرکاتِ اکابر

مدارس اسلامیہ کے اساتذۂ کرام کے نام

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ

بگرامی خدمت حضرات مدرسین وملازمین مدرسہ مظاہر علوم　　بعد سلام مسنون

چند نہایت ہی اہم اور ضروری امور، اکابر کے ارشادات اور ان کے واقعات جو سنے اور دیکھے نقل کرتا ہوں، اہتماماً یہ بھی عرض کردوں کہ مظاہر علوم کی چند اہم اور خصوصی روایات رہی ہیں جن پر میں نے اپنے اکابرؒ کو بہت ہی اہتمام اور پابندی کرتے دیکھا ہے۔

ضروری امور مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مدرسہ کے مالیات اور معاملات میں بہت احتیاط سے کام لیا جائے۔

میں نے اپنے جملہ اکابرؒ کو مدرسہ کے مالیات اور معاملات میں ہمیشہ نہایت ہی محتاط اور خائف پایا ہے۔ حضرت اقدس قدوۃ الاتقیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کا یہ مقولہ مشہور اور بارہا کا سنا ہوا ہے کہ مدرسوں کے معاملات سے جتنا ڈرتا ہوں اتنا کسی اور چیز سے نہیں ڈرتا، اس لئے کہ اگر کوئی شخص ملازم پیشہ ہو اور اپنی ملازمت میں خیانت یا کوتاہی کرے تو وہ ملازم شخص ملازمت سے سبکدوشی یا موت کے وقت صاحب حق اور مالک سے اگر معاف کرالے تو معاف ہوجاتا ہے۔ لیکن مدرسہ کا مال جو مزدوروں کے دو دو پیسوں کا چندہ ہوتا ہے اس کے معاف کرانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ اسی سلسلہ میں ذمہ داران اور سرپرستان مدرسہ کی بابت مزید وضاحت فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ہم لوگ سرپرستان مدرسہ محض امین ہیں، ہمیں دوسروں کے مال میں معاف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے نیز اگر بعض اوقات مدرسہ کے بعض مصالح کی وجہ سے کسی کی خیانت، بددیانتی اور حق تلفی پر تسامح (چشم پوشی) یا درگزر کا معاملہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ہم لوگوں سے باز پرس نہ ہوگی، لیکن اگر مصالح مدرسہ کے بجائے ہم سرپرستان صرف اپنے تعلقات کی وجہ سے چشم پوشی کریں گے تو ہم بھی مجرم کے ساتھ شریک جرم ہیں۔ اس لئے اب تو مزید معاف کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی معاف کرسکتے ہیں۔

(۲) مدرسہ کے اوقات کا خصوصی خیال رکھا جائے اور اس سلسلہ میں مدرسہ کی افادیت خصوصی طور سے مدنظر رکھی جائے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے مثال کے طور پر متعدد واقعات بیان فرمائے۔

(۱) حضرت اقدس مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ بانی مدرسہ کا معمول تھا کہ جب اسباق کے

اوقات میں کوئی شخص حضرتؒ سے ذاتی تعلقات والا ملاقات کیلئے آجاتا تو سلام وکلام میں جو وقت خرچ ہوتا اور جتنے منٹ صرف ہوتے، حضرت نوراللہ مرقدہٗ فوراً اس وقت کو ایک پرچہ پر تحریر فرما کر کتاب کے اندر محفوظ کر لیتے اور تمام ماہ اسی طرح نوٹ فرماتے رہتے اور اخیر ماہ میں ان اوقات کو جمع فرما کر اتنے وقت کی رخصت درج کروادیتے تھے۔ مثلاً اگر یہ وقت مجموعی طور پر دو گھنٹے ہوتا تو آدھے وقت کی رخصت مدرسہ کے اندر درج کراتے اور اس سے زیادہ کی صورت میں ایک ڈیڑھ دن کی رخصت مدرسہ کے اندر لکھوادیتے تھے۔

(۲) اسی طرح حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ (جو بانیان مدرسہ میں ہیں) مدرسہ کے ملازم نہیں تھے، ایک بار مدرسہ قدیم (دفتر) کی تعمیر کے لئے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے، ان کے سفر خرچ والے رجسٹر میں بندہ (حضرت شیخ الحدیثؒ) نے خود پڑھا ہے، اس میں ایک جگہ تحریر تھا کہ کلکتہ سے فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کی غرض سے گیا تھا اگرچہ وہاں چندہ بھی کافی ہو گیا مگر میرا اس جگہ جانا چندہ کی نیت سے نہیں تھا اس لئے وہاں تک کی آمدورفت کا اتنا خرچ مدرسہ کے حساب سے نکال دیا جائے اور میرے ذاتی اخراجات میں شمار کیا جائے۔

(۳) حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے بارے میں میں نے دو واسطوں سے سنا ہے کہ حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک عزیز سے ملاقات کے لئے مدرسہ کے قالین سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ کر بات کی۔ عزیز کے قالین پر بیٹھنے کا اصرار کرنے پر حضرت سہارنپوریؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قالین مدرسہ نے سبق پڑھانے کے لئے دیا ہے ذاتی استعمال کے لئے نہیں دیا ہے۔

خوب دھیان رہے کہ مدرسہ کا مال، مال وقف ہے اور حقوق العباد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں نہایت غفور اور رحیم ہے مگر حقوق العباد میں وہ بھی نہایت عادل ہے اس لئے آپ سے بہت اہتمام سے درخواست کرتا ہوں کہ مدرسہ کے اوقات، مدرسہ کے مالیات وغیرہ میں کوتاہی کر کے اپنی بربادی کے اسباب پیدا نہ فرمائیں۔ میرا بار بار کا مشاہدہ ہے کہ جس نے فرضی بیماری کی چھٹی لی وہ ضرور بیمار ہو کر رہا اور یہی نہیں بلکہ بیماری کی چھٹی سے جتنے پیسے بچے تھے اس سے کہیں زیادہ پیسے دواؤں میں خرچ ہو گئے۔ لہٰذا آپ سے مخلصانہ درخواست ہے کہ للہ اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔

اس مختصر تحریر کے بعد پھر مخلصانہ اور باصرار درخواست کرتا ہوں کہ دوستو! اگر اپنی صلاح وفلاح چاہتے ہو تو مدرسہ کے مال کو جس میں مدرسہ کے اوقات جن کی تنخواہ لی جاتی ہے سب سے زیادہ داخل ہیں **لقطة المسلم حرقة النار او كما قال صلى الله عليه وسلم** کے مراقبہ کے ساتھ دیکھا کریں، تجربہ بھی کرلیں کہ جو شخص مدرسہ کے مال میں جن میں اوقات مدرسہ بھی داخل ہیں جتنا بھی زیادہ اہتمام کرے گا اتنا ہی خوش حال اور بےفکر رہے گا اس ناکارہ کی تحریر کو مدرسین وملازمین سبھی کو ملاحظہ کرادی جائے۔ فقط والسلام (حضرت مولانا) محمد زکریا عفی عنہ، ۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ

R.N.I. REGD. NO. 62469/95U.M.
URDU MONTHLY MAGAZINE

MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR





MADRASA MAZAHIR ULOOM

SAHARANPUR-247001 (U.P) INDIA, PH. 0132-2655542
E-Mail: jamiamazahir@gmail.com